

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ماہنامہ  
چتر گرام

شمارہ  
18

ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، اپریل ۲۰۱۰ء

# السنة

مدیر

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

• مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا

• لوکانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

• رقص کی شرعی حیثیت

• صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنہ انکار حدیث

• وفات النبی ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ



زائرانہ مقصود و تحقیق، جمہور، پاکستان



## اہل سنت کون؟ حافظ ابو یحییٰ نور پوری

امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ (۱۱۵-۱۲۰۶ھ) اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے اور اسی کو اپنا عقیدہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”۔۔۔ اور میں ایمان رکھتا ہوں کہ جنت اور جہنم دونوں مخلوق ہیں، دونوں آج موجود ہیں اور وہ کبھی فنا نہ ہوں گی۔ مؤمن روز قیامت اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جیسا کہ وہ چودہویں رات چاند کو دیکھ لیتے ہیں، اس کے دیکھنے میں کوئی تنگی محسوس نہیں کریں گے۔ میں یہ بھی ایمان رکھتا ہوں کہ محمد ﷺ خاتم النبیین والمرسلین ہیں۔ کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا، جب تک وہ آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں لے آتا اور آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی نہیں دے دیتا۔ (میرا یہ بھی اعتقاد ہے کہ) آپ ﷺ کی امت میں سے افضل ترین شخصیت سیدنا ابوبکر صدیق ہیں، پھر سیدنا عمر فاروق، پھر سیدنا عثمان ذوالنورین، پھر سیدنا علی المرتضیٰ، پھر عشرہ مبشرہ میں سے (خلفائے اربعہ کے علاوہ) باقی صحابہ، پھر بدر والے، پھر درخت کے نیچے بیعت رضوان کرنے والے، پھر باقی تمام صحابہ کرام ہیں۔ ﷺ

میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سے محبت رکھتا ہوں، ان کے محاسن بیان کرتا ہوں، ان سے راضی ہوں، ان کے لیے استغفار کرتا ہوں، ان کی غلطیوں کو بیان کرنے سے اپنی زبان کو روکتا ہوں، ان کے درمیان ہونے والے اختلافات (میں تبصرہ کرنے) سے خاموش رہتا ہوں اور اس فرمانِ باری تعالیٰ کی تعمیل کرتے ہوئے ان کی فضیلت پر پورا یقین رکھتا ہوں:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (الحشر: ۱۰/۵۹) (اور وہ لوگ) (بھی مالِ فے کے حق دار ہیں) جو کہتے ہیں، اے ہمارے رب! ہمیں معاف کر دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی، جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گزر چکے ہیں، تو ہمارے دلوں میں ایمان والے لوگوں کے خلاف کینہ پیدا نہ کرنا، اے ہمارے رب! یقیناً تو رؤوف و رحیم ہے۔)

میں امہات المؤمنین پر راضی ہوں، جو کہ ہر بُرائی سے پاک ہیں۔ میں اولیائے کرام کی کرامات و مکاشفات کا بھی اقراری ہوں مگر وہ اللہ تعالیٰ کے حق (عبادت) میں سے کسی چیز کے مستحق نہیں ہو سکتے، نہ ہی ان سے وہ چیزیں طلب کی جاسکتی ہیں، جن پر صرف اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ میں کسی مسلمان کے لیے جنت و جہنم کا حکم نہیں لگاتا، سوائے ان لوگوں کے جن پر رسول اللہ ﷺ نے (جنت یا جہنم کا) حکم لگا دیا ہے، البتہ میں نیک و کار کے لیے (جنت کی) امید رکھتا ہوں اور بدکار پر (جہنم واجب ہونے کا) ڈر رکھتا ہوں۔ میں کسی گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر قرار نہیں دیتا اور نہ دائرۃ اسلام سے کسی مسلمان کو خارج قرار دیتا ہوں۔ میں ہر نیک و فاجر خلیفہ کے ساتھ مل کر جہاد کرنا درست سمجھتا ہوں۔ ان (فاجر خلیفوں) کی اقتداء میں نماز جائز

ہے۔۔۔“ (مؤلفات ابن عبد الوہاب: ص ۱۰-۱۱) جاری ہے۔۔۔

## مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے تہہ بند، شلوار، پاجامہ، قمیص وغیرہ لٹکانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا تکبر اور اسراف ہے۔ یہ عمل شنیع متکبرین اور عورتوں سے مشابہت وغیرہ کا موجب ہے، جبکہ اس سے اجتناب واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ (بنی اسرائیل: ۳۷/۱۷)

”اور زمین پر اکڑ کر مت چلو، نہ تو آپ زمین کو پھاڑ سکتے ہیں اور نہ ہی لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (لقمان: ۱۸/۳۱)  
”اللہ تعالیٰ متکبر اور شخی خورے کو پسند نہیں فرماتے۔“

ٹخنوں سے نیچے شلوار وغیرہ لٹکانے والے کے بارے میں شدید وعید آئی ہے، جیسا کہ:  
① سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بينا رجل يجرّ إزاره ، خسف به ، فهو يتجلجل في الأرض إلى يوم القيامة))  
”((تم سے پہلے لوگوں میں) ایک آدمی تھا، جو تکبر اور غرور کی وجہ سے اپنا تہہ بند گھسیٹ کر چلتا تھا (جان بوجھ کر اس نے کپڑا لٹکایا ہوا تھا)، وہ اس وجہ سے زمین میں دھنسا دیا گیا، تا قیامت زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔“ (صحیح بخاری: ۵۷۹۰، مسلم: ۴۹/۲۰۸۸ من حدیث ابی ہریرۃ)

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:  
((ما أسفل من الكعبين من الإزار في النار))  
”ٹخنوں کے نیچے جسم کا وہ حصہ جہاں تہہ بند پہنچے، وہ آگ میں جلے گا۔“ (صحیح بخاری: ۵۷۸۷)

③ سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:  
”تین شخص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت ان سے کلام نہیں کریں گے، نہ ان کی طرف نظر

رحمت سے دیکھیں گے، نہ ہی ان کو گناہوں سے پاک کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین بار فرمائی، سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا، اے اللہ کے رسول! وہ خاسر و خائب لوگ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((المسبل إزاره، والمنان، والمنق سلعته بالحلف الكاذب)) ”① ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا ② احسان جتلانے والا اور ③ جھوٹی قسم اٹھا کر مال فروخت کرنے والا۔“ (صحیح مسلم: ۱۰۶)

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ :

وہ احادیث جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر نہیں ہے، ان کے عموم کو ان احادیث کے ساتھ خاص کر دیا جائے، جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر ہے، یعنی وعید اس شخص کے لیے ہوگی، جو تکبر کی وجہ سے کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔“

(التمهيد لابن عبد البر: ۳/۲۴۴، شرح صحيح مسلم للنووي: ۱۰۷۱/۲-۱۹۴-۱۹۵)

علامہ ابن العربی المالکی رحمہ اللہ اس شبہ کا ازالہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

لا يجوز لرجل أن يجاوز بثوبه كعبه ويقول: لا أتكبر فيه، لأن النهي قد تناول لفظاً وتناول علته، ولا يجوز يتناول اللفظ حكماً، فيقال: إني لست ممن يمتثله، لأن تلك العلة ليست فيّ، فيأنه مخالفة للشرعية، ودعوى لا تسلم له، بل من تكبره يطيل ثوبه وإزاره، فكذبه معلوم... ”کسی آدمی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکائے اور کہے کہ میرا اس میں تکبر کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ کہنا اس لیے جائز نہیں ہے کہ اس پر (کپڑا لٹکانے کی) نہی لفظی اعتبار سے شامل ہے اور یہ نہی کی علت، یعنی تکبر کو بھی شامل ہے۔ جب ایک لفظ حکم پر بھی شامل ہو تو آدمی کے لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ میں اس کا ارتکاب نہیں کرتا، کیونکہ یہ (تکبر والی) علت مجھ میں نہیں پائی جاتی۔ یہ شریعت کی مخالفت ہے اور ایسا دعویٰ ہے، جسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ اپنے تکبر ہی کی وجہ سے اپنے کپڑے اور تہ بند کو لمبا رکھتا ہے، لہذا اس کا جھوٹ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔“ (عارضۃ الاحوذی لابن العربی: ۲۳۸/۷)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس عبارت کا ما حصل ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: الإسبال يستلزم جرّ الثوب وجرّ الثوب يستلزم الخيلاء، ولو لم يقصد اللابس الخيلاء....

”کپڑا لٹکانے سے گھسیٹنا لازم آتا ہے اور گھسیٹنے سے تکبر لازم آتا ہے، اگرچہ پہننے والا تکبر کا ارادہ نہ بھی رکھتا ہو۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۲۶۴/۱۰)

④ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ سیدنا جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وارفع إزارك إلى نصف الساق، فإن أبيت فإلى الكعبين، وإيّاك وإسبال الإزار، فإنّها من المخيلة، وإنّ الله لا يحبّ المخيلة..)) ”اپنا تہ بند نصف پنڈلی تک اٹھا کر رکھو، اگر تم اس سے انکاری ہو تو (کم از کم) دونوں ٹخنوں تک رکھو، تہ بند ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے بچو، یہ تکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔“ (سنن ابی داؤد، ۴۰۸۴، واللفظ له، المعجم الكبير للطبرانی: ۶۳۸۶، السنن الكبرى للبيهقي: ۲۳۶/۱۰، وسنده صحيح)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ (۲۷۲۲) نے ”حسن صحیح“ اور امام حاکم رحمہ اللہ (۱۸۶/۴) نے ”صحیح“ کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں: ((وإيّاك وتسبيل الإزار، فإنّها من الخيلاء، والخيلاء لا يحبّها الله)) ”ٹخنوں سے نیچے تہ بند لٹکانے سے بچو، کیونکہ یہ تکبر ہے اور تکبر کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے۔“ (مسند الامام احمد: ۶۳/۵، وصححه ابن حبان (۵۲۲) وقال ابن عساکر: حديث حسن غريب (معجم الشيوخ لابن عساکر: ۱۴۹۱)، وسنده صحيح)

اس حدیث میں تنصيص و تصریح ہے کہ جان بوجھ کر کپڑا ٹخنے سے نیچے لٹکانا ہی تکبر اور عجب و افتخار کی علامت ہے، خواہ تکبر کا قصد نہ بھی ہو۔

⑤ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرا گزر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ہوا۔ میری حالت یہ تھی کہ (غیر ارادی طور پر) میری شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے عبد اللہ! اپنی شلوار اوپر کر، میں نے اوپر کر لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور زیادہ کر، میں نے اور زیادہ کر لی۔ اس کے بعد میں ہمیشہ خیال رکھتا تھا (کہ کہیں شلوار ٹخنے سے نیچے نہ چلی جائے)۔ لوگوں نے پوچھا، شلوار کہاں تک ہونی چاہیے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نصف پنڈلی تک۔“ (صحیح مسلم: ۲۰۸۶)

⑥ ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھ کر فرمایا:



(( من هذا ؟ فقلت : أنا عبد الله ! فقال : إن كنت عبد الله ، فارفع إزارك ))  
 ”یہ کیوں ہے؟ میں نے عرض کی، میں عبد اللہ ہوں، آپ نے فرمایا، اگر تو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) ہے تو اپنا تہبند ٹخنوں سے اوپر کر لے۔“ (مسند الامام احمد : ۱۴۷/۲، مسند ابی یعلیٰ : ۵۶۴۴، شعب الایمان للبیہقی : ۶۱۱۹، وسندہ صحیح)

غور فرمائیں کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان کی نیت کے بارے میں سوال نہیں کیا کہ کیا آپ نے کپڑا تکبر کی وجہ سے لٹکایا ہے یا ویسے ہی؟ بلکہ جوں ہی دیکھا، کپڑے کو اوپر اٹھانے کا حکم صادر فرمادیا، لہذا یہ کہنا کی تکبر کی نیت ہو تو ناجائز ہے، ورنہ نہیں۔ کیا سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حسن ظن یہ ہے کہ انہوں نے تکبر کی بنا پر لٹکایا تھا، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا؟ اصل بات یہ ہے کہ تکبر کی قید اس لیے لگائی گئی کہ بسا اوقات نہ سمجھی میں یا خود بخود تہبند نیچے ہو جاتا ہے، اس پر یہ وعید نہیں، لیکن جو جانتے بوجھتے اس طرح کرے گا، وہ متکبر ہوگا۔

⑥ سیدنا شرید بن سوید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک ثقیفی شخص کے پیچھے چل رہے تھے، یہاں تک کہ اس کی طرف لپک (عام چال اور دوڑنے کے درمیان کی چال چل) کر اس کا کپڑا پکڑ لیا اور فرمایا: ارفع إزارک (فی رواية الحمیدی : ۸۱۰، واحمد : ۱۹۴۰۴، وسندہ صحیح : واتق الله) ”اپنا تہبند ٹخنوں سے اوپر کر لیں اور اللہ سے ڈرجائیں۔“

راوی کہتے ہیں کہ اس آدمی نے اپنے ٹخنوں سے کپڑا اٹھالیا اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! میرے پاؤں ٹیڑھے ہیں اور گھٹنے ٹکراتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو خوبصورت پیدا کیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) اس آدمی نے تا وفات اپنا تہبند نصف پنڈلی تک رکھا۔

(مسند الامام احمد : ۳۹۰/۴، ح : ۱۹۷۰۱، وسندہ صحیح ورجالہ ثقات)

⑦ عبد الرحمن بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے تہبند کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا، میں آپ کو بادل کیل جواب دیتا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: (( إزار المؤمن إلى أنصاف ساقیه ، لا جناح علیہ فیما بینہ و بین الکعبین ، ما أسفل من ذلک ففي النار ، ما أسفل من ذلک ففي النار ، لا ينظر الله يوم القيامة إلى من جرّ إزاره بطرا )) ”مؤمن کے تہبند کی جگہ نصف پنڈلی

ہے۔ نصف پنڈلی اور ٹخنوں کے درمیان رکھے تو کوئی گناہ نہیں۔ (تہبند رکھنے کا) جو حصہ اس (ٹخنے) سے نیچے ہوگا، وہ آگ میں جلے گا، (تہبند رکھنے کا) جو حصہ اس (ٹخنے) سے نیچے ہوگا، وہ آگ میں جلے گا، جس نے تہبند کو تکبر کی وجہ سے (یعنی جان بوجھ کر) ٹخنوں سے نیچے لٹکایا، اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔“ (موطا الامام مالک: ۹۱۴/۲-۹۱۵، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲/۲۴۴، شرح السنة للبعوی: ۳۰۸۰)

اس کی سند ”حسن“ ہے۔ اس کے راوی العلاء بن عبد الرحمن جمہور کے نزدیک ”صدوق، حسن الحدیث“ ہیں اور صحیح مسلم کے مرکزی راوی ہیں۔

اس حدیث کو امام ابو عوانہ رحمۃ اللہ علیہ (۴۸۳/۵) اور امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (۵۴۴۷) نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔

⑥ سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے صحابی رسول سیدنا سہل بن خطیبہ رضی اللہ عنہ سے کہا، آپ ہمیں کوئی ایسی بات بتائیں، جو ہمیں فائدہ دے اور آپ کو نقصان نہ دے۔ اس پر انہوں نے کہا:

قال لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم: نعم الرجل خريم الأسديّ لولا طول جَمَّتِه وإسبال إزاره، فبلغ ذلك خريما، فعجل، فأخذ شفرة، فقطع بها جَمَّتِه إلى أذنيه ورفع إزاره إلى أنصاف ساقيه. ”خريم اسدي بھی کیا خوب آدمی ہے اگر اس کے بال (کندھوں تک) لمبے نہ ہوں اور اس کی شلوار ٹخنوں سے نیچے نہ ہو۔ یہ بات خريم اسدي رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے جلدی سے استرا لیا اور بال کانوں تک کاٹ دیئے اور شلوار نصف پنڈلی تک اٹھا لی۔“ (سنن ابی داؤد: ۴۰۸۹، مسند الامام احمد: ۱۸۰/۴، المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۱۸۴/۴، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ”صحیح الاسناد“ اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ”صحیح“ کہا ہے۔

اس کا راوی ہشام بن سعد جمہور کے نزدیک ”موثق، حسن الحدیث“ ہے۔ ان شاء اللہ!

⑦ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایمان افروز واقعہ:

جب سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ایک مجوسی یا عیسائی نے وار کر کے زخمی کر دیا اور آپ کا پیٹ چاک ہو گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کو نبیذ پلائی گئی، وہ آنتوں کے راستے باہر نکل آئی، دودھ لایا گیا، آپ نے پیا تو

وہ بھی آنتوں کے راستے باہر نکل آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جان گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانبر نہیں ہو سکیں گے۔ لوگ آپ کی تعریف کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان آیا، اس نے کہا، اے امیر المؤمنین! آپ کو بشارت ہو، آپ کو صحبت رسول کا شرف حاصل ہے، یقیناً آپ جانتے ہیں کہ آپ کو سبقت اسلام کا بھی شرف حاصل ہے، آپ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے عدل و انصاف کے پھریرے لہرا دیئے، اب اللہ تعالیٰ آپ کو شہادت کے منصب پر فائز کرنے والے ہیں۔ (یہ سن کر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عاجزی و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے) فرمایا، میری خواہش ہے کہ یہ سب امور میرے لیے برابر ہو جائیں، نہ عذاب ہو نہ ہی ثواب! جب وہ نوجوان واپس پلٹا تو اس کا تہبند زمین پر لگ رہا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابن اخی! ارفع ثوبک، فإِنَّهٗ أَنْفَقَ لثَوْبِکَ وَأَنْتَ قِیْلُ لِرَبِّکَ۔ ”اے میرے بھتیجے! اپنا کپڑا اٹھوں سے اوپر اٹھالیں۔ اس میں آپ کے کپڑوں کی صفائی ہے اور تقویٰ کا باعث ہے۔“ (صحیح بخاری: ۳۷۰۰)

معلوم ہوا کہ کپڑا اٹھانے سے نیچے لٹکانا کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر قربان جائیے کہ آپ نے وقت وفات بھی مخالفت سنت کو برداشت نہ کیا، جبکہ آپ اس وقت زخموں سے پُور پُور تھے، خون میں لت پت تھے، زندگی اور موت کی کشمکش میں ایک نوجوان کو تہبند ٹخنے سے اوپر اٹھانا کا کہہ رہے ہیں، ساتھ ساتھ اس کی حکمت بھی عیاں کر دی اور رہتی دنیا تک کے نوجوانوں کو سبق دے دیا کہ ٹخنے ننگے رکھنا ضروری ہے۔ یہ تقویٰ کی بات ہے۔

⑩ مسلم بن یناق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی دیکھا، جو اپنا تہبند گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ آپ نے فرمایا، آپ کس قبیلہ سے ہو؟ اس نے اپنا نسب بیان کیا، وہ بنو لیث سے تھا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے پہچان لیا اور فرمایا کہ میں نے ان دونوں کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، جو شخص تکبر کے ارادہ سے تہبند لٹکائے گا، اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔“ (صحیح مسلم: ۴۵/۲۰۸۵)

⑪ محمد بن زیاد کہتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی دیکھا، جو اپنا تہبند گھسیٹ کر چل رہا تھا، وہ بحرین کا امیر تھا۔ زمین پر پاؤں مار مار کر کہہ رہا تھا کہ امیر آگیا، امیر آگیا۔ میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص تکبر کی وجہ سے تہبند گھسیٹ کر چلے،



اللہ تعالیٰ اس کی طرف (روز قیامت) نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔“ (صحیح مسلم: ۲۰۸۷)

⑫ ابواسحاق السیمی تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: رَأَيْتُ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ

رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِرُونَ عَلَى أَنْصَافِ سَوْقِهِمْ ، فَذَكَرَ أَسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ ، وَابْنَ عُمَرَ ، وَزَيْدَ بْنَ أَرْقَمَ ، وَالْبَرَاءَ بْنَ عَازِبٍ ... ”میں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے بہت سے لوگ دیکھے ہیں، جو تہبند نصف پنڈلی پر رکھتے تھے، پھر انہوں نے سیدنا اسامہ بن زید، ابن عمر، زید بن ارقم اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۲/۸-۳۹۳، وسندہ حسن)

⑬ عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو تہبند میں دیکھا، وہ آگے سے اس کا کونہ اپنے پاؤں کی پیٹھ پر رکھتے اور پیچھے سے اٹھا کر رکھتے تھے۔ میں نے کہا، آپ اس طرح تہبند کیوں باندھتے ہیں؟ فرمانے لگے کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح باندھتے تھے۔“

(سنن ابی داؤد: ۴۰۹۶، وسندہ حسن)

کسی صحابی سے جان بوجھ کر ٹخنے سے نیچے کپڑا ٹکنا ثابت نہیں ہے۔

⑭ محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ (صحابہ و تابعین) نصف پنڈلی سے

اوپر تہبند اٹھا کر رکھنا پسند کرتے تھے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۲/۸، وسندہ حسن)

**تنبیہ نمبر ①:** سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کپڑا ٹکاتے

تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا، میں پتلی پنڈلیوں والا انسان ہوں۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۸۹/۸، وسندہ حسن)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کی سند کو ”جید“ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اس کو اس حالت

پر محمول کریں گے کہ وہ جگہ جہاں شلوار رکھنا مستحب ہے، یعنی نصف پنڈلی، اس سے زیادہ لٹکی ہوئی تھی،

کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے ٹخنوں سے نیچے تہبند کو لٹکایا

ہو۔ پنڈلیوں کے باریک ہونے کی علت اسی طرف رہنمائی کرتی ہے۔۔۔“ (فتح الباری: ۲۶۴/۱۰)

**تنبیہ نمبر ②:** سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خِيَلًا لَمْ يَنْظُرِ اللَّهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، قَالَ أَبُو بَكْرٍ : يَا

رسول اللہ! إن أحد شقى إزارى يسترخى إلا أن أتعاهد ذلك منه ، فقال النبى صلی اللہ علیہ وسلم : لست ممن يصنعه خيلاء . ”جس نے تکبر کی وجہ سے کپڑا گھسیٹا، روز قیامت اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے، اے اللہ کے رسول! میرے تہبند کا ایک پہلو لٹک جاتا ہے، ہاں جب میں اس پر محافظت کروں تو نہیں لٹکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں، جو تکبر کی وجہ سے کپڑا لٹکاتے ہیں۔“ (صحیح بخاری : ۵۷۸۴)

ایک روایت میں ہے: فقال أبو بكر : إنه يسترخى إزارى أحيانا . ”سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا، کبھی کبھار میرا تہبند (غیر ارادی طور پر) خود بخود لٹک جاتا ہے۔“

(مسند الامام احمد : ۱۴۷/۲، مسند ابی یعلیٰ : ۵۶۴۴، شعب الایمان للبيهقي : ۶۱۱۹، وسندہ

صحیح)

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ جو تکبر کے ارادے سے لٹکاتا ہے، وہ اس وعید میں داخل ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان جان بوجھ کر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے، خواہ تکبر کا قصد ہو یا نہ ہو، اس کے لیے یہ وعید شدید ہے۔

ہاں! اگر کوئی آدمی کپڑا ٹخنوں سے اوپر رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود غیر ارادی یا غیر اختیاری طور پر کپڑا نیچے لٹک جاتا ہے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہوگا، کیونکہ وہ معذور ہے، جیسا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں پوری پوری محافظت کرتا ہوں تو تہبند نیچے نہیں لٹکتا۔ کبھی ذرا سی غفلت کروں تو نیچے لٹک جاتا ہے۔ حدیث میں یسترخی کا لفظ بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ تہبند خود بخود نیچے لٹک جاتا تھا، وہ بھی کبھی کبھار نہ کہ ہمیشہ۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ قصداً نہیں لٹکاتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ وعید ہر اس انسان کو شامل ہے، جو تکبر کے ارادے سے لٹکایا ہے یا بغیر تکبر کے ارادے سے۔ تب ہی تو یہ سوال کیا تھا کہ غیر ارادی طور پر غفلت کی وجہ سے میرا تہبند لٹک جاتا ہے۔ کیا میں بھی اسی وعید میں داخل ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں۔

ہاں! اگر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ پوچھتے کہ میں خود شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر رکھتا ہوں اور میرا تکبر کا ارادہ نہیں ہوتا، پھر اگر آپ ﷺ اجازت دے دیتے تو بات صحیح ہوتی، جبکہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں

ہے، لہذا یہ حدیث اس بات پر دلالت گناں ہے کہ جو جان بوجھ کر کپڑا لٹکاتا ہے، خواہ تکبر کا قصد نہ بھی ہو، وہ اس وعید میں داخل ہے، کیونکہ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا بذات خود تکبر ہے۔ اس میں قصد و ارادہ کا کوئی عمل دخل نہیں۔

**تنبیہ نمبر ۳ :** سیدنا ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے پاس تھے کہ سورج کو گہن لگ گیا۔ رسول اللہ ﷺ یجرّ ردائہ ، حتی دخل المسجد ...  
 ”آپ رضی اللہ عنہ تہبند گھسیٹتے ہوئے (جلدی سے) کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ آپ مسجد میں تشریف لے آئے تو ہم بھی مسجد میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ نے ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں۔“

(صحیح بخاری: ۱۰۴۰)

دوسری روایت میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب خواب میں اذان سنی، پھر حالت بیداری میں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سن کر گھر سے باہر نکلے تو فخر جبرّ ردائہ ... ”آپ تہبند گھسیٹتے ہوئے نکلے۔“ (مسند الامام احمد: ۴۳/۴، سنن ابی داؤد: ۴۹۹، وسندہ حسن و محمد ابن اسحاق موثق عند الجمهور)

اس حدیث کو امام ابن الجارود (۱۵۸)، امام ابن خزیمہ (۳۷۱)، امام ابن حبان (۱۶۷۹) اور حافظ نووی رحمہ اللہ (خلاصۃ الاحکام: ۲۷۶/۱) نے ”صحیح“ کہا ہے۔  
 امام ترمذی رحمہ اللہ (۱۷۹) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (نتائج الافکار: ۳۳۸/۱) نے ”حسن صحیح“ قرار دیا ہے۔

یہ اور اس جیسی دوسری احادیث کا مطلب یہ ہے کہ اوپر والی چادر گھسٹ رہی تھی نہ کہ تہبند، کیونکہ رداء اوپر والی چادر کو کہتے ہیں۔ ورنہ تہبند کو لٹکانے سے تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے وقت وفات بھی منع فرمایا تھا۔

⑤ سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: أخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بعضلة ساقى أو بعضلة ساقه ، قال : فقال : الإزار هاهنا ، فإن أبيت فهاهنا ، فإن أبيت فهاهنا ، فإن أبيت فلا حق للإزار فى الكعبين ...

”رسول اللہ ﷺ نے میری پنڈلی پکڑ کر فرمایا، تہبند کو یہاں رکھو، اگر آپ انکاری ہیں تو یہاں

رکھو، اگر آپ انکاری ہیں تو یہاں رکھو، اگر آپ انکاری ہیں تو (یاد رکھو) ٹخنے پر تہبند کا کوئی حق نہیں۔“  
(مسند الامام احمد: ۳۹۶/۵، وسندہ حسن)

اس کا راوی مسلم بن نذیر ”حسن الحدیث“ ہے۔ امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں:  
”لا بأس بحديثه۔“ ”اس کی حدیث میں کوئی حرج نہیں۔“ (الجرح والتعديل: ۱۹۷/۸)  
امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ (۱۷۸۳) نے اس کی حدیث کو  
”حسن صحیح“ کہا ہے۔ یہ تو یقین ہے۔

یہ حدیث واضح طور پر پتہ دے رہی ہے کہ جان بوجھ کر، خواہ تکبر کا ارادہ نہ بھی ہو تو کپڑا ٹخنے سے  
نیچے لٹکا ہی نہیں سکتے۔

**فائدہ نمبر ①:** حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”مطلق طور پر ٹخنوں  
سے نیچے شلوار لٹکانے کے بارے میں جو وعید آتی ہے، اس سے وہ شخص مستثنیٰ ہے، جو ضرورت و عذر کے  
پیش نظر لٹکاتا ہے۔ مثال طور پر ٹخنے پر زخم ہے۔ کھیاں تکلیف پہنچاتی ہیں۔ وہ شلوار یا چادر کے علاوہ  
کوئی دوسری چیز ڈھانپنے کے لیے نہیں پاتا۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے عبدالرحمن بن  
عوف رضی اللہ عنہ کو خارش کی وجہ سے ریشمی قمیص پہننے کی اجازت دی تھی۔“ (فتح الباری: ۲۵۷/۱۰)  
عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ والی روایت صحیح بخاری (۵۸۳۹) اور صحیح مسلم (۲۰۷۶) میں موجود ہے۔

**فائدہ نمبر ②:** عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹخنے ڈھانپ کر رکھیں،  
جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے تکبر کی وجہ سے  
کپڑا لٹکایا، اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں،  
اے اللہ کے رسول! فکیف یصنع النساء بذیولھن؟ قال: ترخینہ شبرا، قال  
: قالت: إذا تنكشف أقدامھن؟ قال: ترخینہ ذراعا، لا یزدن علیہ ((

”عورتیں کپڑے کا دامن کہاں رکھیں گی؟ وہ (نصف پنڈلی سے) ایک (درمیان ہاتھ کی)  
بالشت (گن انگلی اور انگوٹھے کے درمیان فاصلہ کے) لٹکا کر رکھیں۔ راوی کہتے ہیں کہ سیدہ ام  
سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا، تب تو ان کے پاؤں ننگے ہو جائیں گے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، وہ دو  
بالشت نیچے رکھ سکتی ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔“

(سنن النسائي: ٥٣٣٨، سنن الترمذی: ١٧٣١، وسندہ صحیح)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ”حسن صحیح“ ہے۔

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **وفی الحدیث رخصة للنساء فی جرّ الإزار**، **لأنه یكون أستر لهنّ**۔ ”اس حدیث میں عورتوں کے لیے کپڑا اٹھینے کی رخصت ہے، کیونکہ ان کے لیے زیادہ ستر کا باعث ہے۔“

**ایک شبہ اور اس کا ازالہ :** وہ احادیث جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر نہیں ہے، ان کے عموم کو ان احادیث کے ساتھ خاص کر دیا جائے گا، جن میں خیلاء (تکبر) کا ذکر ہے، یعنی یہ وعید صرف اس شخص کے لیے ہوگی، جو تکبر کی بنا پر کپڑا اٹھانے سے بچنے لگا رہا ہے۔

خوب یاد رہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے، ورنہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا عورتوں کے کپڑا اٹھانے کے بارے میں استفسار کا کیا معنی؟ بلکہ حدیث سننے کے بعد وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ تکبر کا ارادہ ہو یا نہ ہو، یہ ممانعت عام ہے۔ اس لیے سوال کیا کہ عورتوں کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ ان کو پاؤں ڈھانپنے کے لیے کپڑا اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب تو نبی اکرم ﷺ نے واضح کیا کہ وہ اس مسئلہ میں مردوں کے حکم سے خارج ہیں۔ عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹخنے ڈھانپ کر رکھیں۔ یہ مسلمانوں کا اجماعی مسئلہ ہے، اس لیے نصف پنڈلی سے ایک بالشت نیچے کپڑا رکھنا مستحب اور دو بالشت جائز ہے۔ اسی طرح مردوں کے ٹخنے سے نیچے تہہ بند، چادر، پانجامہ، شلوار وغیرہ رکھنا ممنوع و حرام اور گناہ کبیرہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُوری کا باعث ہے۔ مرد کے لیے نصف پنڈلی تک کپڑا رکھنا مستحب اور ٹخنے سے اوپر رکھنا جائز ہے۔

**فائدہ نمبر ③ :** سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

ما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في الإزار فهو في القميص .

”جو حکم آپ ﷺ کا تہبند کے بارے میں دیا ہے، وہی قمیص کے بارے میں بھی ہے۔“

(مسند الامام احمد: ١١٠/٢، ١٣٧، سنن ابی داؤد: ٤٠٩٥، السنن الکبریٰ للبیہقی: ٢٤٤/٢، وسندہ

صحیح)

مطلب یہ ہے کہ قمیص بازیمنت اور ستر پوش ہو، ضرورت سے زیادہ لمبی اور کھلی ہوگی تو تکبر میں

شامل ہو جائے گی، جو کہ ممنوع اور حرام ہے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: **الإسبال في الإزار والقميص والعمامة .**

”اسبال تہبند قمیص اور پگڑی (سب) میں (ممنوع) ہوتا ہے۔“ (سنن ابی داؤد: ۴۰۹۴، سنن

النسائی: ۵۳۳۴، سنن ابن ماجہ: ۳۵۷۶، وسندہ صحیح)

اسبال، ارسال اور ارعاء، یہ تینوں ہم معنی ہیں۔ تہبند، قمیص اور پگڑی سب میں اسبال ہوتا ہے۔ شریعت نے ہر ایک کی حدود مقرر کی ہیں۔ تہبند کے حوالے سے مرد کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ ٹخنے سے نیچے نہ لٹکائے، اسی طرح قمیص کے بارے میں بھی گزر چکا ہے۔

جہاں تک پگڑی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں شریعت کی رہنمائی یہ ہے کہ نہ تو اس کے زیادہ بل ہوں، نہ اس کا کوئی کونہ یا سر زیادہ لٹکا ہوا ہو۔ اگر ممنوع اسبال کی صورت اختیار کر گئی تو یہ تکبر ہے اور ممنوع ہے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: **كان النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اعْتَمَّ سَدَلَ عِمَامَتِهِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ .** ”نبی اکرم ﷺ جب پگڑی باندھتے تو اس کا سر دونوں کندھوں کے درمیان لٹکاتے تھے۔“ (سنن الترمذی: ۱۷۳۶، وسندہ حسن)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”حسن غریب“ کہا ہے۔ اس کا راوی یحییٰ بن محمد المدنی الجاری ”حسن الحدیث“ ہے۔ امام بخاری، امام ابن حبان، یحییٰ بن محمد کے شاگرد یحییٰ بن یوسف الزمی نے ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ليس بحديثه بأس .** ”اس کی حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اس کے دوسرے راوی عبدالعزیز بن محمد الدراوردی بھی جمہور کے نزدیک ”ثقة“ ہیں۔

سیدنا عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر دیکھا کہ آپ نے کالی پگڑی باندھ رکھی تھی، اس کے دونوں کونے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکا رکھے تھے۔

(صحیح مسلم: ۱۳۵۹)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: **وَعَمَّمَهُ بِعِمَامَةِ بَيْضَاءَ ، وَأَرْسَلَ مِنْ خَلْفِهِ أَرْبَعَ أَصَابِعَ أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ ، وَقَالَ : هَكَذَا يَا ابْنَ عَوْفٍ اعْتَمَّ ! فَإِنَّهُ أَعْرَبَ**



وأحسن . ”نبی اکرم ﷺ نے ان (سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ) کو سفید پگڑی باندھی، چار انگلیوں یا ان کے قریب قریب سر ان کے پیچھے ڈال دیا اور فرمایا، اے (عبدالرحمن) ابن عوف! اس طرح پگڑی باندھا کرو، کیونکہ یہ زیادہ واضح اور زیادہ خوبصورت ہے۔“

(المستدرک علی الصحیحین للحاکم : ۵۴۰/۴، وسندہ صحیح)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”صحیح الاسناد“ کہا ہے اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ”صحیح“ کہا ہے۔

یہ سند اس بات پر واضح دلیل ہے کہ امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سماع و لقاء ثابت ہے۔ **السنة** شمارہ نمبر ① صفحہ نمبر ۳۰ پر لکھا گیا تھا کہ ان کا سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سماع نہیں ہے۔ یہ بات مرجوح ہو گئی ہے۔

✽ محمد بن زید العمری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ انہوں نے کالی پگڑی باندھ رکھی تھی، دو بابت کے برابر اس کا سرا پیچھے ڈالا ہوا تھا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۴۲۲/۸، وسندہ صحیح)

**فائدہ نمبر ④ :** سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی ٹخنوں سے

نیچے کپڑا لٹکائے نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا، جاؤ وضو کرو۔ وہ گیا اور وضو کیا، پھر (ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکاتا ہوا) آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا، جاؤ اور وضو کرو۔ وہ دوبارہ گیا، وضو کیا، پھر آیا تو ایک آدمی نے کہا، اے اللہ کے رسول! کیا وجہ ہے کہ آپ نے ایک با وضو انسان کو وضو کرنے کا حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، وہ شلوار لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ شلوار لٹکانے والے شخص کی نماز قبول نہیں فرماتے۔“ (مسند الامام احمد : ۶۸/۴، سنن ابی داؤد : ۴۰۸۶، ۶۳۸، السنن

الکبریٰ للنسائی : ۹۷۰۳، السنن الکبریٰ للبیہقی : ۲۴۷/۲، وسندہ حسن، ابو جعفر المدنی المؤذن

حسن الحديث، حسن الترمذی حدیثہ (۳۴۴۸) وصححه ابن حبان (۲۶۹۹) وهذا توثیق منهما،

وروی عنه یحییٰ بن ابی کثیر وقال الامام ابو حاتم الرازی : یحییٰ بن ابی کثیر امام لا یحدث إلا عن

ثقة (الجرح والتعديل : ۱۴۲/۹)، قال الحافظ النووی (ریاض الصالحین : ۷۹۵) : رواه ابو داؤد بإسناد

صحیح علی شرط مسلم، ووافقه الذہبی (الکبائر ص ۱۷۹)، وقال الحافظ الہیثمی (مجمع الزوائد

: ۱۲۵/۵) : رواه أحمد ورجاله رجال الصحیح)

ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ ٹخنوں سے نیچے شلوار وغیرہ لٹکانے والے کی نماز قبول نہیں فرماتے۔ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ وضو اور نماز لوٹائے۔

صاحب المنہل العذب المورود (۱۲۳/۵) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ”ضعیف“ ہے، بالفرض ثابت ہو بھی جائے تو یہ منسوخ ہے، کیونکہ اس کے خلاف اجماع واقع ہو گیا ہے۔

لیکن ان کا اس حدیث کو ”ضعیف“ کہنا صحیح نہیں ہے، ہم نے اس کی سند کا ”حسن“ ہونا بطریق احسن واضح کر دیا ہے، نیز اس کی منسوخیت کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ ہم اس اجماع سے واقف نہیں ہو سکے، جو اس کے خلاف ہوا ہے، بلکہ اس موہوم اجماع کے خلاف ثابت ہے، جیسا کہ:

مجاہد بن جبر تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کان یقال: من مس إزاره كعبه لم تقبل له صلاة، قال: وقال ذرّ: من مس إزاره الأرض لم تقبل له صلاة.

”کہا جاتا تھا کہ جس کا تہبند ٹخنے کو چھو جائے، اس کی نماز قبول نہیں ہوتی، (حصین بن عبد الرحمن المسلمی تابعی رحمہ اللہ) کہتے ہیں کہ ذر (بن عبد اللہ الحمدانی) نے کہا، جس کا تہبند زمین کو چھوئے، اس کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۸۸/۸ وسندہ صحیح)

لہذا اجماع کا یہ دعویٰ باطل ہوا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ووجه هذا الحديث - والله أعلم - أن إسبال الإزار معصية، وكلّ من واقع معصية، فإنه يؤمر بالوضوء والصلاة، فإن الوضوء يطفىء حريق المعصية.

”اس حدیث کی توجیہ یہ ہے کہ ٹخنے سے نیچے کپڑا نکالنا معصیت ہے، جو بھی کسی معصیت میں مبتلا ہوگا، اسے وضو اور نماز کا حکم دیا جائے گا، کیونکہ وضو معصیت (نافرمانی) کی آگ کو بجھاتا ہے۔“ (التہذیب علی سنن ابی داؤد: ۵۰/۶)

علامہ طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لعل السرّ في أمره بالتوضوء، وهو طاهر، أن يتفكر الرجل في سبب ذلك الأمر، فيقف على ما ارتكبه من شناعة، وأن الله تعالى ببركة أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم طهارة الظاهر، يطهر باطنه من التكبر والخيلاء، لأن طهارة الظاهر مؤثرة في طهارة الباطن.

”با وضو انسان کو وضو کا حکم دینے میں شاید یہ حکمت پنہاں ہو کہ (دوبارہ وضو کرنے کے بارے

میں) حکم میں وہ غور و فکر کرے، جس بُری حرکت کا وہ مرتکب ہو رہا ہے، اس پر خبردار ہو جائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے ظاہری طہارت کے حکم (کی تعمیل) کی برکت سے اس کے باطن کو تکبر اور افتخار و عُجب سے پاک کر دے گا، کیونکہ ظاہری طہارت باطنی طہارت پر اثر انداز ہوتی ہے۔“

(شرح الطیبی: ۲/۲۶۸)

علامہ ابن العربی المالکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **إِنَّ الصَّلَاةَ حَالُ تَوَاضُعٍ وَإِسْبَالِ الْإِزَارِ** فعل متکبر، فتعارضاً، وأمره له بإعادة الوضوء أدب له وتأكيد عليه، ولأنَّ المصلِّي يَنَاجِي رَبَّهُ، وَاللَّهُ لَا يَنْظُرُ إِلَى مَنْ جَوَّ إِزَارَهُ، وَلَا يَكَلِّمُهُ، فَكَذَلِكَ لَمْ يَقْبَلْ صَلَاتِهِ. ”نماز تواضع کی حالت ہوتی ہے، جبکہ کپڑا اٹخوں سے نیچے لٹکانا متکبر آدمی کا کام ہے، یہ دونوں کام باہم متعارض ہیں۔ اس شخص کو وضو لوٹانے کا حکم اسے ادب سکھانے اور تاکید کرنے کا سبب ہے، کیونکہ نمازی اپنے رب سے مناجات (سرگوشیاں) کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کپڑا اٹھینے والے شخص کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے اور نہ ہی اس سے کلام کریں گے، اسی لیے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔“ (عارضۃ الاحوذی: ۷/۲۳۸)

اس بات کی تاکید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

①۶ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

**إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنْظُرُ إِلَى مَسْبِلِ الْإِزَارِ.** ”یقیناً اللہ تعالیٰ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانے والے کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھتے۔“ (مسند الامام احمد: ۱/۳۲۲، سنن النسائی: ۵۳۳۵، مصنف ابن ابی شیبہ: ۸/۳۸۸، وسندہ صحیح)

حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

❁ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: **مَنْ أَسْبَلَ إِزَارَهُ فِي صَلَاتِهِ خِيَلَاءَ، فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي حَلٍّ وَلَا حَرَامٍ.** ”جس نے تکبر کی وجہ سے نماز میں کپڑا لٹکایا، اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی سروکار نہیں (یا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کو حلال کریں گے نہ دوزخ کو حرام)۔“ (سنن ابی داؤد: ۶۳۷، السنن الکبریٰ للنسائی: ۹۶۸۰، وسندہ حسن)

اگر کوئی کہے کہ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر تکبر کا ارادہ نہ ہو تو نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مفہوم مخالف تب ہوگا، جب کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ یہاں تو نص موجود ہے کہ ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا ہی تکبر ہے، لہذا جو بھی جان بوجھ کر کپڑا لٹکائے گا، وہ اس زمرہ میں آئے گا، خواہ تکبر کا ارادہ نہ بھی ہو۔

**الحاصل :** وہ احادیث جن میں خیلاء (تکبر کی وجہ سے) کپڑا لٹکانے کا ذکر ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ جان بوجھ کر جو بھی کپڑا لٹکائے گا، کیونکہ بھول کر لٹک جانے سے تکبر ہوتا ہی نہیں۔ اور جان بوجھ کر کپڑا لٹکانا خود تکبر ہے، جیسا کہ حدیث سے واضح کیا جا چکا ہے۔

مرد کے لیے ٹخنوں سے نیچے شلوار وغیرہ لٹکانا ممنوع و حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سِتَّةَ لَعْنَتِهِمْ وَلَعْنَةُ اللَّهِ ..... وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي .

”چھ شخص ایسے ہیں، جن پر میں نے لعنت کی ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہے۔۔۔ (ان میں سے ایک) وہ شخص ہے، جو میری سنت کو چھوڑتا ہے۔“ (سنن الترمذی: ۲۱۵۴، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۵۷۴۹) اور امام حاکم رحمہ اللہ (۵۲۵/۲) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

اس حدیث کے راوی عبد الرحمن بن ابی الموال کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ثقة مشهور . ”یہ مشہور ثقہ راوی ہے۔“ (المغنی للذهبی: ۶۱۴/۲)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: من ثقات المدنيين . ”یہ ثقہ مدنی

راویوں میں سے ہے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۱۸۳/۱)

اس کا دوسرا راوی عبید اللہ بن عبد الرحمن بن مہب ”مختلف فیہ“ ہے۔ راجح یہی ہے کہ وہ جمہور کے نزدیک ”حسن الحدیث“ ہے۔

یاد رہے کہ اس حدیث میں سنت سے مراد واجبی اور فرضی سنتیں، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ڈاڑھی رکھنا، شلوار ٹخنوں سے اوپر رکھنا وغیرہ مراد ہیں۔ اب جو بھی شخص جان بوجھ کر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا، اس فرمان نبوی کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اس پر لعنت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی لعنت سے دُور رکھے اور اپنی رحمت کا مستحق بنائے! آمین

رقص جاہل و بے عقل اور بے دین صوفیوں کی ایجاد کردہ بدعت ہے۔ یہ بالاجماع ممنوع ہے۔ سلف صالحین و ائمہ دین میں سے کوئی اس کا قائل و فاعل نہیں رہا، البتہ اہل علم سے اس کی مذمت اور ممانعت ضرور ثابت ہے۔

✽ علامہ عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے (م ۸۵۵ھ) نے صوفیوں کی کارستانیوں کے ذکر و رد میں کیا خوب کہا ہے: **ولا اعتبار لما أبدعته الجهلة من الصوفية في ذلك (أى الغناء وغيره) ، فإنك إذا تحققت أقوالهم في ذلك ورأيت أفعالهم وقفت على آثار الزنادقة منهم .** ”اور (غناء وغیرہ کے نام پر) جاہل صوفیوں نے جو بدعات نکال لی ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ آپ جب اس بارے میں ان کے اقوال کی تفتیش کریں گے اور ان کے افعال کو دیکھیں گے تو ان میں بے دین و زندیق لوگوں کی علامات پائیں گے۔“

(عمدة القاری : ۴۰۷/۲۱)

رقص غیر شرعی رسم ہے، جو دین کے نام پر جاری کر دی گئی ہے، لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں: **وقد انعقد اجتماع العلماء أنّ من ادّعى الرقص قربه إلى الله تعالى فقد كفر .** ”اس بات پر علمائے کرام کا اتفاق و اجماع واقع ہو چکا ہے کہ جو شخص رقص کو قرب الہی کا ذریعہ قرار دے، وہ کافر ہے۔“

(صید الخاطر لابن الجوزی : ص ۱۵۴)

علامہ احمد طحاوی حنفی (م ۱۲۳۳ھ) لکھتے ہیں: **وأما الرقص والتصفیق والصّريخ وضرب الأوتار والصّجّ والبوق الذي يفعله بعض من يدعى التّصوّف ، فإنّه حرام بالإجماع ، لأنّها زیّ الکفّار .** ”رہا رقص کرنا، تالیاں پیٹنا، شور شرابا، ہارمونیم بجانا، چیخ و پکار اور دھل بجانا، جو کہ صوفیت کے بعض دعویداروں کا معمول ہے، یہ بالاجماع حرام ہے،

کیونکہ یہ کفار کا طور طریقہ ہے۔“ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۱۷۴، صفۃ الاذکار)  
 حنفی حنفی لکھتے ہیں: ”من يستحل الرقص قالوا بكفره، ولا سيما بالدف  
 يلهو ويزمر.“ ”جو رقص کو حلال سمجھتا ہے، وہ ان (علمائے کرام) کے بقول کافر ہے، خصوصاً  
 جو ساتھ ساتھ کھیل تماشا کرتا اور ساز بجاتا ہے۔“ (الدر المختار: ۴/۴۴۶)

اس قول کی تشریح میں ابن عابدین شامی حنفی (۱۱۹۸-۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:  
 والمراد به التمايل والخفض والرفع بحركات موزونة كما يفعله بعض من  
 ينتسب إلى التصوف، وقد نقل في البرازية من القرطبي إجماع الأئمة على حرمة  
 الغناء وضرب القضيب والرقص. ”اس (رقص) سے مراد جھومنا اور موزون حرکات  
 کے ساتھ نیچے اوپر ہونا ہے، جیسا کہ بعض وہ لوگ کرتے ہیں، جو تصوف کا دم بھرتے ہیں۔ برازیہ میں  
 علامہ قرطبی سے غناء، ڈھول پیٹنا اور رقص کرنے کی حرمت پر ائمہ کا اجماع و اتفاق نقل کیا گیا ہے۔“  
 (فتاویٰ شامی: ۴/۴۴۶)

مشہور مفسر علامہ قرطبی رحمہ اللہ (۶۰۰-۶۷۱ھ) لکھتے ہیں: استدلال العلماء بهذه الآية  
 على ذم الرقص وتعاطيه، قال الإمام أبو الوفاء ابن عقيل: قد نص القرآن على  
 النهي عن الرقص، فقال: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ و ذم المختال والرقص  
 أشد المرح والبطر. ”اس آیت کریمہ سے علمائے کرام نے رقص اور اس میں  
 انہماک کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ امام ابو الوفاء ابن عقیل کا فرمان ہے کہ قرآن کریم نے رقص کی  
 ممانعت پر نص قائم کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ (اور زمین پر اکڑ کر  
 مت چلو)، جھومنا (ناچنا) اور رقص کرنا تکبر و غرور سے بھی (گناہ میں) سخت ہے۔“ (تفسیر القرطبی:  
 ۱۰/۲۶۳)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ  
 اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (لقمان: ۶۷/۳۱)  
 ”اور کچھ لوگ بے ہودہ باتیں خریدتے ہیں تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ  
 کریں اور اسے مذاق بنائیں۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“



رقص لہوا الحدیث ہے، لہذا ممنوع و حرام ہے۔

اس کے باوجود بعض گمراہ صوفی اس بدعتِ قبیحہ اور شنیعہ کو شرعی دلائل سے کشید کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں، جیسا کہ:

**دلیل نمبر ①:** سیدنا ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ﴾ (ص: ۴۲/۳۸)

”ہم نے حکم دیا اے ایوب! اپنا پاؤں ماریں، (دیکھو) یہ نہانے کے لیے ٹھنڈا اور پینے کو (میٹھا پانی ہے)۔“

علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: استدلال بعض الجہال المتزہدہ وطعام

المتصوِّفۃ بقولہ تعالیٰ لایُوب: ﴿أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾ علیٰ جواز الرقص ...

”بعض زہد و تقویٰ کی ملیح سازی کرنے والے جاہلوں اور صوفی ازم کا نعرہ بلند کرنے والے کمینے

لوگوں نے سیدنا ایوب علیہ السلام کو جاری کیے گئے فرمانِ باری تعالیٰ ﴿أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾ (ص: ۴۲/۳۸)

سے رقص کے جواز پر استدلال کیا ہے۔“ (تفسیر القرطبی: ۲۱۵/۱۵)

حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ گمراہ صوفیوں کے رد و جواب میں لکھتے ہیں:

وهذا الاحتجاج بارد ، لأنه لو كان أمر بضرب الرجل فرحا كان لهم فيه شبهة

، وإنما أمر بضرب الرجل لينبع الماء ، قال ابن عقيل : أين الدلالة في مبتلى أمر

عند كشف البلاء بأن يضرب برجله الأرض لينبع الماء إعجازاً من الرقص ، ولئن

جاز أن يكون تحريك رجل قد أنحلها تحكم الهوام دلالة على جواز الرقص في

الإسلام جاز أن يجعل قوله تعالى لموسى : ﴿اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ دلالة

على ضرب الجماد بالقضبان ، نعوذ بالله من التلاعب بالشَّرْع .

”یہ استدلال بالکل بودا ہے، کیونکہ اگر پاؤں مارنے کا حکم خوشی کے لیے دیا گیا ہوتا تو ان کے

لیے اس استدلال کی کوئی گنجائش ہوتی، سیدنا ایوب علیہ السلام کو تو اس لیے پاؤں مارنے کا حکم دیا گیا تھا کہ

پانی پھوٹ پڑے۔ ابنِ عقیل کہتے ہیں کہ ایک بیمار آدمی، جسے بیماری سے نجات پانے کے لیے معجزہ کے

طور پر پانی نکالنے کے لیے زمین پر پاؤں مارنے کا حکم دیا گیا، اس سے رقص کی دلیل کہاں سے آگئی؟

اگر کیڑوں کے کھائے ہوئے (سیدنا ایوب علیہ السلام) کے جسم مبارک میں کیڑوں کا پڑنا بے ثبوت بات ہے۔ غ۔ م) پاؤں کو حرکت دینے سے اسلام میں رقص کی دلیل لینا جائز ہے تو یہ بھی جائز ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو پتھر پر عصا مارنے کے حکم کو جمادات کو ڈنڈے سے پیٹنے کی دلیل بنانا بھی جائز ہونا چاہیے۔ شریعت کو کھیل تماشا بنانے سے اللہ کی پناہ!“ (تلبیس ابلیس لابن الجوزی: ۱/۲۳۰)

**دلیل نمبر ۲) :** سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

وكان يوم عيد يلعب فيه السودان بالدرق والحراب ، فإما سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم وإما قال : أتشتين تنظرين ؟ قلت : نعم ! فأقمنى ورائه ، خدّى على خدّه ، وهو يقول : دونكم يا بنى أرفدة ، حتّى إذا مللت ، قال : حسبك ، قلت : نعم ! فاذهبي . ”عید کا دن تھا، حبشی لوگ ڈھالوں اور نیزوں کے ساتھ (جنگی کھیل) کھیل رہے تھے۔ یا تو میں نے سوال کیا تھا یا پھر رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا تھا، کیا آپ دیکھنے کی خواہش مند ہیں؟ میں نے عرض کی، جی ہاں! آپ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کیا، میرا رخسار آپ کے رخسار مبارک کے اوپر تھا، آپ ﷺ فرما رہے تھے، کھیلے رہو، اے بنی ارفدہ! جب میں تھک گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا، بس؟ میں نے عرض کی، جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا، اچھا جاؤ۔“

(صحیح بخاری: ۹۵۰، صحیح مسلم: ۲۰/۸۹۲)

صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: جاء حبش يزفنون في يوم عيد في المسجد . ”ایک بار عید کے دن حبشی لوگ آ کر مسجد میں جنگی مشقیں کرنے لگے۔“

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے کی روایت ہے: كانت الحبشة يزفنون بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم ويرقصون ويقولون : محمد عبد صالح ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ما يقولون ؟ قالوا : يقولون : محمد عبد صالح . ”حبشی لوگ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جنگی مشقیں کر رہے تھے اور رقص کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے، محمد ﷺ نیک آدمی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا، یہ کیا کہتے ہیں؟ صحابہ نے بتایا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ محمد ﷺ نیک آدمی ہیں۔“

(مسند الامام احمد: ۱۵۲/۳، وسندہ صحیح وصححه ابن حبان: ۵۸۷۰)

صحیح ابن حبان میں الفاظ ہیں: **وَيَتَكَلَّمُونَ بِكَلَامٍ لَا يَفْهَمُهُ .**

”وہ ایسی کلام کر رہے تھے، جسے آپ ﷺ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔“

❀ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے: **وَهُمْ يَلْعَبُونَ وَيَرْقُصُونَ .**

”وہ کھیل رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔“ (المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۱۳۵۹)

اس کی سند سخت ”ضعیف“ ہے، کیونکہ: ① امام طبرانی رحمہ اللہ کے شیخ ہاشم بن مرثد کی توثیق

ثابت نہیں۔ ② قرطہ راوی ”مجهول“ اور غیر معروف ہے۔ اس کو حافظ ذہبی رحمہ اللہ (المیزان: ۳/۳۸۷) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (التقريب: ۵۵۳۵) نے لا يُعرف (غیر معروف) کہا ہے، لہذا سند سخت ”ضعیف“ ہے۔

❀ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۸۵۲-۷۷۳ھ) لکھتے ہیں: **واستدلّ قوم من**

**الصّوفية بحديث الباب على جواز الرّقص وسماع آلات الملاهي ، و طعن فيه الجمهور باختلاف المقصدين ، فإنّ لعب الحبشة بحرابهم كان للتّمرين على الحرب ، فلا يحتجّ به للرّقص في اللّهُو .** ”صوفیوں کے ایک گروہ نے اس حدیث

سے رقص اور آلات موسیقی کے سماع پر استدلال کیا ہے۔ جمہور علمائے کرام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے دونوں مقصد مختلف ہیں، کیونکہ حبشی لوگ تو جنگی مشق کے لیے نیزوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، لہذا اس سے لہو و لعب میں رقص کرنے پر کوئی دلیل نہیں لی جاسکتی۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۶/۵۵۳)

❀ حافظ ابن الجوزی رحمہ اللہ (م ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں: **زفن الحبشة نوع من**

**المشى ، يفعل عند اللّقاء للحرب .** ”حبشی لوگوں کے رقص سے مراد ایک قسم کی چال ہے،

جو جنگ میں دشمن سے ملاقات کے وقت چلی جاتی ہے۔“ (تلبیس ابلیس لابن الجوزی: ۱/۲۳۰)

❀ یہی بات علامہ قرطبی مفسر رحمہ اللہ نے فرمائی ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۵/۲۱۵)

❀ حافظ نووی رحمہ اللہ یزفون کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

**معناه يرقصون ، وحمله العلماء على التّوثّب بسلامتهم ولعبهم بحرابهم على**

**قريب من هيئة الرّقص ، لأنّ معظم الروايات إنّما فيها لعبهم بحرابهم ، فتأوّل هذه**

**اللفظة على موافقة سائر الروايات .** ”اس کا معنی رقص کرنا ہے، علمائے کرام نے اس سے

مراد اسلحہ کے ساتھ ان کا اچھلنا کودنا اور نیزوں کے ساتھ ان کا کھیلنا مراد لیا ہے، جو کہ رقص کی کیفیت سے قریب قریب ہوتا ہے۔ چونکہ اکثر روایات میں ان کے نیزوں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر ہے، لہذا اس لفظ کی باقی روایات کے مطابق ہی تفسیر کی جائے گی۔“ (شرح صحیح مسلم للنووی: ۱۸۶/۶)

❀ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **بينما الحبشة يلعبون عند رسول الله صلى الله عليه وسلم بحرابهم إذ دخل عمر بن الخطاب ، فأهوى إلى الحصاء يحصبهم بها ، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم : يا عمر ! دعهم .** ”اس دوران کہ حبشی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے نیزوں کے ساتھ (جنگی کھیل) کھیل رہے تھے کہ اچانک سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور وہ کنکریوں کی طرف بھجکے کہ ان کو ماریں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے عمر! ان کو چھوڑ دو۔“

(مسند الامام احمد: ۳۰۸/۲، صحیح بخاری: ۲۹۰۱، صحیح مسلم: ۸۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حبشی لوگ عید کے دن، یعنی خوشی کے موقع پر جنگی مشقوں میں مصروف تھے۔ وہ یہ کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و اکرام میں نہیں کر رہے تھے۔ تب ہی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کو ڈانٹنے لگے تھے اور کنکریاں مارنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روکنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے۔ اگر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم والا کام تھا تو کیا (نعوذ باللہ!) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گستاخ رسول تھے کہ ان کو یہ کام پسند نہ آیا اور اس کو روکنے کے درپے ہو گئے تھے؟ بعض لوگ جہالت اور غلو کی بنیاد پر اس اقدام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں رقص قرار دیتے ہیں، جبکہ محدثین کرام اس کو جنگی مشق قرار دے رہے ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں یہ مشقیں دیکھ رہی تھی، یہاں تک کہ میرا جی بھر گیا اور میں خود ہی وہاں سے چلی گئی۔ (مسند الامام احمد: ۳۳/۶، صحیح بخاری: ۹۴۹، صحیح مسلم: ۸۹۲)

❀ حافظ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی (۵۷۸-۶۵۲ھ) لکھتے ہیں:

وَأَمَّا لَعِبُ الْحَبْشَةِ فِي الْمَسْجِدِ ، فَكَانَ لَعِبًا بِالْحِرَابِ وَالذَّرْقِ تَوَاتِبًا وَرَقْصًا بِهِمَا ، وَهُوَ مِنْ بَابِ التَّدْرِيبِ عَلَى الْحَرْبِ وَالتَّمْرِينِ وَالتَّشْطِيطِ عَلَيْهِ ، وَهُوَ مِنْ قَبِيلِ الْمَنْدُوبِ ، وَلِذَلِكَ أَبَاحَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ .

”رہا حبشی لوگوں کا مسجد میں کھیلنا تو یہ نیزوں اور ڈھالوں کے ساتھ اچھل کود تھی۔ یہ جنگی تربیت، ٹریننگ اور مشق تھی۔ یہ مستحب کاموں میں سے ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں اس کی اجازت دی تھی۔“ (المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم للقرطبی: کتاب الجمعة، باب ما یقرأ بہ فی صلاة العیدین)

حاصل یہ ہے کہ جنگی مشق کے دوران ایک مخصوص حرکت اور انداز کو رقص سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ محدثین کرام کی تصریحات سے معلوم ہوا ہے۔

**دلیل نمبر ۲:** سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أتینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنا وجعفر وزید، فقال لزید: أنت أخونا ومولانا، فحجل، وقال لجعفر: أشبهت خلقي وخلقي، فحجل وراء حجل زید، ثم قال لی: أنت منی وأنا منك، فحجلت وراء حجل جعفر.

”میں، جعفر (بن ابی طالب) اور زید (بن حارثہ) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا، آپ ہمارے بھائی اور دوست ہیں، وہ ناچے۔ آپ ﷺ نے جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، آپ شکل و صورت اور اخلاق میں میرے مشابہ ہیں تو وہ زید کے ناچنے کے پیچھے ناچے، پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا، آپ مجھ سے اور میں آپ سے ہوں، اس پر میں جعفر رضی اللہ عنہ کے ناچنے کے پیچھے ناچا۔“ (مسند الامام احمد: ۱۰۸/۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۶/۸، ۲۲۶/۱)

**تبصرہ:** اس کی تین سندیں ہیں، ایک مسند احمد میں اور دو بیہقی میں، لیکن یہ سب کی سب ”ضعیف“ ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ والی سند ابواسحاق السبعی کی ”تدلیس“ کی بنا پر ”ضعیف“ ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کی دو سندیں پیش کی ہیں۔ پہلی سند (۶/۸) میں اگرچہ ابواسحاق السبعی نے سماع کی تصریح کی ہے، مگر اس سند کا ایک راوی عبداللہ بن محمد (بن سعید) بن ابی مریم سخت ”ضعیف“ ہے۔

امام ابن عدی رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: عبد اللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم مصری، یحدث عن الفریابی وغیرہ بالباطیل...

”عبداللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم مصری ہے۔ یفریابی وغیرہ سے باطل روایات بیان کرتا ہے۔“

نیز لکھتے ہیں: وعبد الله بن محمد بن سعيد بن أبي مریم هذا إما أن يكون مغفلاً لا يدري ما يخرج من رأسه أو يتعمد ، فإنني رأيت له غير حديث مما لم أذكره أيضاً هاهنا غير محفوظ . ”یہ عبداللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم راوی یا تو اتنا غیر حاضر دماغ تھا کہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے سر سے کیا نکل رہا ہے یا پھر یہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا تھا، کیونکہ میں نے جو احادیث یہاں ذکر نہیں کیں، ان میں بھی اس کی کئی غیر محفوظ احادیث دیکھی ہیں۔“

(الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۲۵۵/۴)

علامہ بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وهو ضعيف جداً . ”یہ سخت ضعیف راوی ہے۔“ (مجمع الزوائد : ۳۸۹/۲)

اس میں دوسری علت یہ ہے کہ ابواسحاق السبعی ”مغلط“ ہیں، ان سے بیان کرنے والے راوی زکریا بن ابی زائدہ ہیں، جو کہ ان سے اختلاط کے بعد بیان کرتے ہیں۔

اور دوسری سند (۲۶۷۸۱) میں ان سے اختلاط سے پہلے بیان کرنے والے راوی اسرائیل بن یونس بیان کرتے ہیں، لیکن وہاں ابواسحاق ”عن“ سے بیان کر رہے ہیں اور وہ ”مدلس“ بھی ہیں، لہذا یہ واقعہ تمام سندوں سے مردود ہے۔

والحمد لله !

حافظ بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) لکھتے ہیں: وفي هذا إن صحّ دلالة على جواز الحجل ، وهو أن يرفع رجلاً ويقفز على الأخرى من الفرح ، فالرقص الذي يكون على مثاله يكون مثله في الجواز . ”اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو اس میں حجل کی اجازت ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی خوشی سے ایک ٹانگ اٹھائے اور دوسری پرناچے، چنانچہ جو رقص اس طرح کا ہوگا، وہ جواز میں اسی کی طرح ہوگا۔“ (السنن الكبرى للبيهقي : ۲۶۷۸۱)

جب یہ روایت ہی لحاظ سند ثابت نہیں ہو سکی تو اس کی دلالت بھی خود بخود ختم ہوگئی۔ دوسری بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ حافظ بیہقی رحمہ اللہ بھی اسے صحیح نہ سمجھتے تھے، ورنہ ردّ کا اظہار نہ کرتے۔

**دلیل نمبر ۴ :** محمد بن علی بن الحسین الباقر رحمہ اللہ (۵۶-۱۱۸ھ) فرماتے ہیں:

إن ابنة حمزة لتطوف بين الرجال إذ أخذ عليّ بيدها ، فألقاها إلى فاطمة في هودجها ، قال : فاختصم فيها عليّ وجعفر وزيد بن حارثة ، حتى ارتفعت أصواتهم ،



فأيقظوا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ من نومه ، قال : هلمّوا ، أفض بينكم فيها وفي غيرها ، فقال عليّ : ابنة عمّي ، وأنا أخرجتها ، وأنا أحقّ بها ، وقال : جعفر : ابنة عمّي وخالتها عندي ، وقال زيد : ابنة أخي ، فقال في كلّ واحد قولاً رضي به ، ففضي بها لجعفر وقال : الخالة الوالدة ، فقام جعفر ، فحجل حول النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، دار عليه ، فقال النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ما هذا ؟ قال : شيء رأيت الحبشة يصنعونه بملوكهم .

”حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی مردوں کے درمیان گھوم رہی تھی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہودج میں ڈال دیا۔ پھر اس کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ، جعفر اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم جھگڑ پڑے، یہاں تک کہ ان کی آوازیں اونچی ہو گئیں اور انہوں نے (اپنے شور سے) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیدار کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آؤ میں تمہارے درمیان اس بارے میں اور دوسرے معاملات میں فیصلہ کروں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے کہ یہ میری چچا زاد ہے اور میں نے اسے ساتھ لیا ہے اور میں ہی اس کا زیادہ حق دار ہوں۔ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کہنے لگے، یہ میری چچا زاد ہے اور اس کی خالہ میرے عقد میں ہے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یہ میری بھتیجی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے لیے ایسی بات کہی، جس نے ان سب کو راضی کر دیا، پھر فیصلہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں کر کے فرمایا، خالہ والدہ ہی ہے۔ اس پر سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ اٹھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گردنا چنے لگے اور چکر لگانے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ کیا ہے؟ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یہ ایسا کام ہے، جو میں نے جبشی لوگوں کو اپنے بادشاہوں کے ساتھ کرتے دیکھا تھا۔“

(طبقات ابن سعد : ۴/۳۵-۳۶، مصنف ابن ابی شیبہ : ۱۰/۱۷۰، مختصراً)

**تبصرہ :** اس کی سند ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

- ① محمد بن علی الباقر رضی اللہ عنہ تابعی ہیں اور وہ ڈائریکٹ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کر رہے ہیں، لہذا یہ روایت ”مرسل“ ہونے کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔
- ② حفص بن غیاث ”مدلس“ ہیں۔ ثقہ مدلس بخاری و مسلم کے علاوہ ”عن“ سے روایت کرے تو وہ ”ضعیف“ ہوتی ہے۔ اس میں سماع کی تصریح نہیں ہے۔

**دلیل نمبر ⑤ :** قال محمد بن عمر الواقديّ : حدّثني ابن أبي

حبيبة عن داؤد بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباس ، قال : فلما قضى بها لجعفر قام جعفر ، فحجل حول رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ما هذا يا جعفر ! قال : يا رسول الله ! كان النجاشي إذا أرضى أحدًا قام ، فحجل حوله . ”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حمزہ کی بیٹی کا فیصلہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں کر دیا تو وہ کھڑے ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے گردناچنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے جعفر! یہ کیا؟ عرض کی، اے اللہ کے رسول! نجاشی جب کسی کو خوش کرتا تو وہ شخص کھڑا ہوتا اور نجاشی کے گردناچتا (اسی لیے میں نے ایسا کیا ہے)۔“

(المغازی لمحمد بن عمر الواقدي : ۷۳۸/۲، تاریخ دمشق لابن عساکر : ۳۶۱/۱۹، کنز العمال :

(۱۴۰۳۳

**تبصرہ :** یہ روایت موضوع (من گھڑت) ہے، کیونکہ:

① اس کا راوی محمد بن عمر الواقدي جمہور کے نزدیک ”ضعیف، متروک اور کذاب“ ہے۔ حافظ ابن ملقن رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وقد ضعفه الجمهور . ”اسے جمہور نے ضعیف قرار دیا ہوا ہے۔“ (البدر المنير لابن الملقن : ۳۲۴/۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے ”متروک“ کہا ہے۔ (تقریب التہذیب : ۶۱۷۵) امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کتب الواقدي كذب . ”واقدي کی کتابیں جھوٹ کا پلندہ ہیں۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم : ۲۷/۸، وسندہ صحیح)

امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لأنه عندي ممن يضع الحديث . ”میرے نزدیک یہ جھوٹی احادیث گھڑنے والا ہے۔“ (الجرح والتعديل : ۲۷/۸)

امام احمد رحمہ اللہ نے اسے ”کذاب“ قرار دیا ہے۔ (الکامل لابن عدی : ۲۴۷/۶، وسندہ حسن) امام بخاری، امام ابوزرعمہ، امام نسائی اور امام عقیلی رحمہم اللہ نے اسے ”متروک الحدیث“ کہا ہے، امام یحییٰ بن معین اور جمہور نے ”ضعیف“ کہا ہے۔

امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: يروى أحاديث غير محفوظة والبلاء منه ، ومتون أخبار الواقدي غير محفوظة ، وهو بين الضعف . ”یہ غیر محفوظ احادیث

بیان کرتا ہے اور یہ مصیبت اسی کی طرف سے ہے، واقدی کی احادیث کے متون غیر محفوظ ہیں، وہ واضح ضعیف راوی ہے۔“ (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی: ۲۴۳/۶)

② داؤد بن الحصین کی عکرمہ سے روایت کے متعلق امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ما روی عن عکرمہ فمنکر الحدیث۔“ جو احادیث یہ عکرمہ سے بیان کرتا ہے،

ان میں منکر الحدیث ہوتا ہے۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۴۰۹/۳، وسندہ صحیح)

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَأَمَّا الْحَجَلُ فَهُوَ نَوْعٌ مِنَ الْمَشْيِ يَفْعَلُ عِنْدَ الْفَرَحِ، فَأَيْنَ هُوَ مِنَ الرِّقْصِ؟ ”حجل ایک قسم کی چال ہے، جو خوشی کے وقت چلی جاتی ہے، اس کا رقص سے کیا تعلق؟“ (تلبیس ابلیس لابن الجوزی: ۲۳۰/۸)

**دلیل نمبر ⑥:** سیدنا جابر بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے روایت ہے:

”جب سیدنا جعفر بن ابی طالب رحمہ اللہ حبشہ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا استقبال کیا۔ جب سیدنا جعفر رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو ناچنے لگے، یعنی اپنی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی تعظیم میں ایک ٹانگ پر چلنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔“ (دلائل النبوة للبيهقي: ۲۴۶/۴، ح: ۱۵۹۶)

**تبصرہ:** یہ روایت جھوٹ کا پلندہ ہے، کیونکہ:

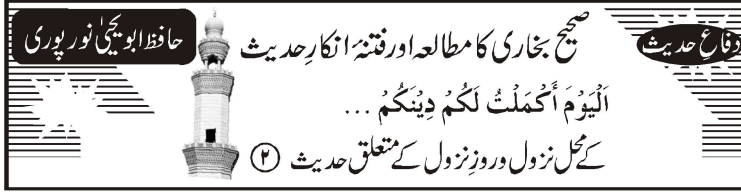
① امام بیہقی رحمہ اللہ اس کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: فِي إِسْنَادِهِ إِلَى الثَّوْرِيِّ مَنْ لَا يَعْرِفُ. ”اس حدیث کی سفیان ثوری کی طرف سند میں ایک مجہول راوی ہے۔“

② امام سفیان ثوری ”مدلس“ ہیں اور سماع کی صراحت نہیں کی۔

③ ابوالزبیر بھی ”مدلس“ ہیں اور ”عن“ کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، جو کہ ”مدلس“ سے بخاری و مسلم کے علاوہ قبول نہیں ہوتا۔

**نوٹ:** بنتِ حمزہ کا واقع صحیح بخاری (۲۶۹۹ وغیرہ) میں بھی موجود ہے، لیکن وہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناچنے کا کوئی ذکر نہیں، لہذا ان روایات پر ضعف کا جو حکم لگایا گیا ہے، وہ ناچ والے سیاق کے متعلق ہے۔

**الحاصل:** رقص ممنوع و حرام ہے، اس کے جواز پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔



## عقلی اعتراضات

**اعتراض نمبر ① :** ”پھر ابوالعمیس اور مسعر کی روایت بتاتی ہے کہ حضرت عمر

سے یہ بات کہنے والا ایک یہودی تھا اور ثوری کی روایت میں ہے کہ متعدد یہودی لوگ تھے۔ اور یس بن یزید کی روایت میں بھی بصیغہ جمع یہود کا ذکر ہے۔ یہ اختلاف قیس بن مسلم کی جہت سے ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ دراصل طارق نے کیا ذکر کیا تھا، ایک یہودی کا یا چند یہودیوں کا؟ قیس نے کبھی

کچھ کہہ دیا، کبھی کچھ۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۵۵/۱)

**جواب :** قارئین کرام! جب اس حدیث کی سند بالکل صحیح ہے اور میرٹھی صاحب کے اس پر کیے گئے تمام اصولی اعتراضات کو ہم نے ان کی بے اصولی ثابت کر دیا ہے تو اب اس پر عقلی اعتراضات کچھ حیثیت نہیں رکھتے، کیونکہ قرآن کریم، جس کی صحت میں کسی مسلمان کو ادنیٰ سا بھی شبہ نہیں، عقلی اعتراضات تو اس میں بھی منکرین نے کر دیئے ہیں اور کتنے ہی مقامات پر انہوں نے بزعم خود قرآن کریم میں تناقض اور اختلاف ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی صحت میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکا۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

روزِ قیامت کے بارے میں قرآن کریم نے ایک مقام پر فرمایا ہے: ﴿كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (السجدة: ۵/۳۲) یعنی اس کی مقدار ایک ہزار سال ہوگی، جبکہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج: ۴/۷۰)، یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔

جس طرح شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب نے حدیث نبوی پر اعتراض کیا ہے، اگر بعینہ یہ اعتراض کوئی منکر قرآن، قرآن کریم پر کر دے اور کہہ دے کہ: (نقل کفر، کفر نہ باشد!)

”سورہ سجدہ بتاتی ہے کہ روزِ قیامت کی مقدار ہزار سال ہوگی، جبکہ سورہ معارج میں پچاس ہزار

سال کا ذکر ہے۔ یہ اختلاف صحابہ کرام کی جہت سے ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ دراصل رسول اللہ ﷺ کے پاس کیا وجہ آئی تھی، ایک ہزار سال یا پچاس ہزار سال؟ صحابہ کرام نے کبھی کچھ کہہ دیا، کبھی کچھ۔۔۔“ تو اس کفریہ اعتراض کا میرٹھی کمپنی کے پاس کیا جواب ہوگا؟ اگر وہ یہاں جمع و تہیہ کی کوئی صورت نکالیں گے تو حدیث میں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے؟ نبی اکرم ﷺ تو دینی معاملات میں اپنی خواہش سے بولتے ہی نہ تھے۔ (النجم: ۵۳/۴۳)

قارئین کرام اللہ کے لیے غور کریں اور بتائیں کہ کیا قرآن پاک پر اس بے وقوفانہ اعتراض سے اس کتاب ذی شان کی صحت میں ذرا برابر بھی کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے؟ یقیناً ہر مسلمان کا جواب ہاں میں ہوگا! پھر خود ہی غور کر لیں کہ حدیث پر اس طرح کے اعتراضات کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

سیدھی سی بات ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ بات تو ایک ہی یہودی نے کی تھی، لیکن اس ایک یہودی کی یہ بات سب یہودی کی نمائندگی تھی، یعنی اس نے تمام یہودی کی طرف سے یہ بات پیش کی تھی اور ادنیٰ سا شعور رکھنے والا آدمی بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ کسی قوم کا نمائندہ اگر کوئی بات کرتا ہے تو وہ ساری قوم کی بات شمار ہوتی ہے اور اسے پوری قوم کی بات قرار دیا جاتا ہے۔

اتنی سی بات بھی جس آدمی کی عقل میں نہیں سما سکی، وہ لگا ہے پوری امت کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراض کرنے!!!

**اعتراض نمبر ② :** ”رہا اس حدیث کا مضمون، جسے طارق بن

شہاب و قبیسہ بن ذؤیب اور محمد بن کعب القرظی نے حضرت عمر اور یہودی کے مکالمہ کے طور پر اور عمار بن ابی عمار نے حضرت ابن عباس اور یہودی کے مکالمہ کے طور پر نقل کیا ہے تو یہ سراسر باطل اور اس المناک حقیقت کی دلیل ہے کہ ان راویوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ کو اس کے سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ کرنے اور اس آیت کو سمجھنے کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا تھا، جس میں یہ ارشاد مذکور ہے۔

یہ ارشاد کوئی مستقل آیت نہیں ہے، بلکہ ایک آیت کے درمیان کا ٹکڑا ہے۔۔۔ سورہ مائدہ کے نزول کا آغاز سن ۷ ہجری میں عمرہ القضاء سے پہلے ہوا تھا۔ اس کے آغاز میں اہل ایمان کو خطاب کر کے ان معاہدوں کو وفا کرنے کا حکم دیا ہے، جو حضور اکرم ﷺ نے مختلف قبائل عرب سے کیے تھے،

خصوصاً جنگی کا وہ دس سالہ معاہدہ، جو سن ۶ ہجری میں بمقام حدیبیہ مشرکین مکہ سے ان ہی کی پیش کردہ شرائط پر منعقد فرمایا تھا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ فتح خیبر کے بعد محمد اللہ مسلمانوں کو زبردست قوت و شوکت حاصل ہو چکی تھی اور ممکن تھا کہ اس قوت و شوکت کے پیش نظر مسلمانوں کو یہ خیال ہونے لگے کہ وہ معاہدے اس وقت کے ہیں، جب ہم اتنے قوی و زور آور نہ تھے۔ اب کیا ضرورت ہے کہ ہم ان سیاسی مصلحتوں پر مبنی معاہدوں کا لحاظ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے اس متوقع و سوسہ کو سراٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا۔۔۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۵۸/۱: ۵۹)

**جواب:** قارئین کرام! ہم نے، بلکہ پوری امت مسلمہ نے جس روایت کی بنا پر اس آیت کریمہ کا محل نزول مقام عرفہ قرار دیا ہے، سب مسلمانوں کے برعکس اس کی صحت پر تو میرٹھی صاحب کو اعتراض ہے، لیکن افسوس ہے کہ میرٹھی صاحب نے اپنے اس دعویٰ پر کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ یہ آیت کریمہ سن ۷ ہجری میں عمرۃ القضاء سے پہلے نازل ہوئی۔ منکرین حدیث کو چاہیے کہ ذرا اس پر ”بے غبار“ نہ سہی کوئی ”غبار دار“ سند ہی پیش کر دیں!!!

آخر میرٹھی صاحب نے کونسا کشف لگایا ہے کہ اجماع امت کے خلاف بغیر دلیل کے ان کو ۷ ہجری میں اس کا نزول نظر آ گیا ہے؟ حالانکہ منکرین حدیث کسی ایک مسلمان مفسر سے بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ اس نے عمرۃ القضاء سے پہلے سورۃ مائدہ کے نزول کا دعویٰ کیا ہو، اس کے برعکس اس طرح کی ایک روایت ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وروی أنّها نزلت منصرف رسول الله من الحديبية، وذكر النقاس عن أبي سلمة... قال ابن العربي: هذا حديث موضوع، لا يحلّ لمسلم اعتقاده....

”ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ سورت رسول اللہ ﷺ کے حدیبیہ سے واپس آنے کے وقت نازل ہوئی۔ نقاش نے ابوسلمہ سے ذکر کیا ہے۔۔۔ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ”موضوع“ (من گھڑت) ہے۔ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اس (کی صحت) کا اعتقاد رکھے۔“ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۳۰/۶)

مفسر ابن عطیہ اندلسی لکھتے ہیں: وهذا عندی لا یشبه کلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ومن هذه السورة ما نزل في حجة الوداع، ومنها ما نزل عام الفتح...



”میرے نزدیک یہ (من گھڑت روایت) نبی کریم ﷺ کی کلام مبارک سے ملتی جلتی بھی نہیں۔ (بلکہ اس کے برعکس) اس سورت کا بعض حصہ حجۃ الوداع میں نازل ہوا اور بعض حصہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوا تھا۔۔۔“ (المحرر الوجیز لابن عطیة: ۱۶۷/۲)

لیجیے! یہ ہے انکارِ حدیث کا انجام بے خیر کہ امت کے اتفاقی فیصلہ صحت کو چھوڑا اور باتھ میں وہ روایت آئی، جسے ائمہ مسلمین من گھڑت اور خود ساختہ قرار دے رہے ہیں اور جس کے الفاظ ہی ایسے ہیں کہ وہ رسول کریم ﷺ کی فصیح و بلیغ زبان سے ادا ہونا ہی ممکن نہیں ہیں۔

پھر میرٹھی صاحب کا یہ قول بھی بالکل باطل ہے کہ اس سورت کے آغاز میں ان معاہدوں کو وفا کرنے کا حکم ہے، جو مسلمانوں نے مختلف قبائل عرب سے کیے تھے، خصوصاً معاہدہ حدیبیہ، حالانکہ کسی مفسر نے اس سورت کے شان نزول کے بیان میں معاہدہ حدیبیہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ بات چودہ سو سال بعد صرف میرٹھی صاحب کو سوچھی ہے۔ اس کے برعکس اس سورت کے شروع میں جن ”عقود“ کو نبھانے اور وفا کرنے کا ذکر ہے، ان کے بارے میں امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَأُولَى الْأَقْوَالِ عِنْدَنَا بِالصَّوَابِ ... وَأَنَّ مَعْنَاهُ أَوْفُوا - يَا أَيُّهَا الَّذِينَ - بِعَقُودِ اللَّهِ الَّتِي أَوْجَبَهَا عَلَيْكُمْ، وَعَقْدُهَا فِيهَا أَحَلَّ لَكُمْ وَحَرَّمَ عَلَيْكُمْ، وَأَلْزَمَكُمْ فَرْضَهُ، وَبَيَّنَّ لَكُمْ حُدُودَهُ، وَأَنَّمَا قُلْنَا ذَلِكَ أُولَى بِالصَّوَابِ مِنْ غَيْرِهِ مِنَ الْأَقْوَالِ، لِأَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ اتَّبَعَ ذَلِكَ الْبَيَانَ عَمَّا أَحَلَّ لِعِبَادِهِ وَحَرَّمَ عَلَيْهِمْ، وَمَا أَوْجَبَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَرَائِضِهِ، فَكَانَ مَعْلُومًا بِذَلِكَ أَنَّ قَوْلَهُ: ﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ أَمْرٌ مِنْهُ عِبَادَهُ بِالْعَمَلِ بِمَا أَلْزَمَهُمْ مِنْ فَرَائِضِهِ وَعَقُودِهِ عَقِيبَ ذَلِكَ، وَنَهَى مِنْهُمْ لَهُمْ عَنْ نَقْضِ مَا عَقَدَهُ عَلَيْهِمْ مِنْهُ ... ”سب اقوال میں سے ہمارے نزدیک رائج یہ ہے۔۔۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ اے ایمان والو! وہ عقود نبھاد، جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیے ہیں، حلت و حرمت میں جو قیود تم پر لگائی ہیں، جو فرض تم پر عائد کیے ہیں اور جو حدود تمہارے لیے بیان کی ہیں۔ ہم نے اسے دوسرے اقوال کی نسبت قرین صواب اس لیے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد اپنے بندوں پر حلال و حرام کی گئی چیزیں بیان کی ہیں اور اپنے عائد کیے ہوئے فرائض ذکر کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (اے ایمان والو! تم اپنے عہدوں کو نبھاد) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں

کو حکم ہے کہ وہ اس کے ان فرائض و عقود کو پورا کریں جو اس حکم کے فوراً بعد بیان ہوئے ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے اپنے مقرر کیے ہوئے فرائض کو پامال کرنے کی ممانعت ہے۔۔۔“ (تفسیر الطبری: ۵۴/۹)

میرٹھی صاحب جو ”سیاق و سباق“ کی بہت رٹ لگاتے ہیں، ان کو امام طبری رحمہ اللہ کا بیان کردہ یہ فی الواقع سیاق و سباق سمجھ نہیں آیا کہ عقود کو پورا کرنے کا جو حکم اس سورت کے شروع میں دیا گیا ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض کی پابندی ہے، کیونکہ ساتھ ہی تو حلت و حرمت کا ذکر آ رہا ہے۔

ائمہ حدیث پر سیاق و سباق کو نہ سمجھ سکنے کا الزام رکھنے والے میرٹھی صاحب کی اپنی عقل یہاں پر بالکل سٹھیا گئی ہے اور مفسرین کا بیان کردہ سیاق و سباق بھی ان کے خانہ عقل میں نہیں سما سکا اور انہوں نے ایسی بے بنیاد بات کہہ دی ہے، جو آج تک کسی مسلمان مفسر نے نہیں کہی، بلکہ ایسا کہنا ان کے نزدیک جائز ہی نہیں، جیسا کہ ہم مفسر ابن عطیہ کے بقول ذکر کر چکے ہیں !!!

قارئین کرام! آپ دیکھ چکے ہیں کہ مفسرین کرام کے مطابق اس سورت کا کچھ حصہ حجۃ الوداع کے موقع پر اور کچھ حصہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوا، لیکن لغت عرب، قرآن کریم اور علم حدیث و تفسیر سے بالکل عاری اور تمام سلف صالحین کی مخالفت کرنے والے شخص کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سورت عمرۃ القضاء سے پہلے ۷ ہجری میں نازل ہوئی۔ اب فیصلہ آپ پر ہے کہ آپ کس کی بات مانیں گے؟

**اعتراض نمبر ۳ :** ”یہ تیسری آیت ہے، اسی کے ضمن میں اپنی یہ نعمت یاد

دلائی کہ مشرکین کو دین اسلام سے سرسبز نہ ہو سکنے کی جو آس لگی ہوئی تھی، اپنا دم توڑ چکی ہے اور اصول و فروع کے لحاظ سے تمہارا دین اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے۔ اس طرح تم پر اللہ کا یہ انعام پورا ہو چکا ہے۔

اب تمہیں اس پورے دین کے تحت زندگی گزارنا اور ہمیشہ اپنے رب کا فرمانبردار رہنا ہے۔ یہ ہی روش تمہارے لیے پسندیدہ ہے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد مضمون بالا کا تتمہ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ جانور، جن

کا گوشت کھانا تمہیں حرام ہے، حالت اضطرار میں بقدر ضرورت ان کا گوشت تناول کر لینے کی رخصت ہے۔۔۔ یہ ہم نسق آیات ایک ہی سلسلہ کی ہیں اور ان کا نزول اس وقت ہوا ہے، جب رسول اللہ ﷺ

اپنے اصحاب کے ساتھ عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لے جانے والے تھے۔ جب حقیقت یہ ہے تو اس بے ہودہ بکواس کی کیا تک ہے کہ ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ کا نزول سن ۱۰

ہجری میں نویں ذی الحجہ کو عرفات میں ہوا تھا۔ طارق بن شہاب و قبصہ بن ذویب و محمد بن کعب قرظی کی

ذکر کردہ کہانی بھی قطعاً غلط ہے اور عمار بن ابی عمار کی بیان کردہ کہانی بھی باطل ہے۔ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی تھی نہ حضرت ابن عباس نے۔ ان یا وہ گوراویوں نے نہ معلوم کس سے سنی ہوئی یہ غلط کہانی تو روایت کر ڈالی اور یہ نہ سوچا کہ اس سے لازم آتا ہے کہ تقریباً تین سال تک مسلمان اس آیت کو ناقص پڑھتے رہے ہوں۔۔۔ کیونکہ ان راویوں کے بقول ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ کا نزول ہوا ہی نہ تھا اور اسی ناقص طور سے لکھنے والوں نے یہ آیت لکھی ہو، پھر نویں ذی الحجہ کو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا ہو کہ اس آیت کے درمیان میں یہ اضافہ کر لو اور ایسا ہوا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا، حالانکہ صحیح تو کیا، کسی ضعیف روایت میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ نہ ہی ان راویوں نے یہ سوچا کہ اس آیت میں ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ سے پہلے متصل ﴿الْيَوْمَ يَبْسُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ﴾ آیا ہے اور دونوں آیات ہم نسق ہیں۔ جب ارشادِ اوّل، یعنی ﴿الْيَوْمَ يَبْسُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ﴾ سن ۷ ہجری میں نازل ہوا ہے تو ارشادِ ثانی، یعنی ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...﴾ کو سن ۱۰ ہجری میں نازل شدہ قرار دینے کی کیا تگ ہے؟“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۵۹۱-۶۱)

**جواب :** ① قارئین کرام ذرا میرٹھی صاحب کی دوغلی پالیسی ملاحظہ فرمائیں کہ سلف صالحین کے خلاف اپنی بے ٹکی تفسیر کو ”جملہ معترضہ“ کا سہارا دے کر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن سب امت کی طرف سے کی گئی اتفاقی تفسیر میں ان کو اکثر یہی عیب نظر آیا ہے اس سے ہم نسق آیات میں کوئی ربط نہیں رہتا!

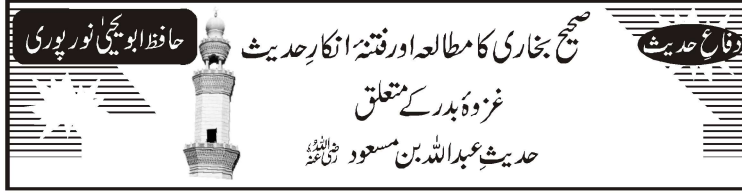
تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی وہ تیرگی جو میرے نامہ سیاہ میں تھی  
حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ عقود کو پورا کرنے کا حکم دینے کے بعد حلت و حرمت کا ذکر جملہ معترضہ نہیں، بلکہ پچھلی بات کا ہی تسلسل ہے، یعنی جن عقود کی ایفاء کا حکم تھا، اب انہی کو بیان کیا جا رہا ہے۔  
مشہور مفسر علامہ فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں: **إِعْلَمُ أَنَّ تَعَالَى لِمَا قَرَّرَ بِالْآيَةِ الْأُولَى عَلَى جَمِيعِ الْمُكَلَّفِينَ أَنَّهُ يُلْزِمُهُمُ الْإِنْقِيَادَ لِجَمِيعِ تَكَالِيفِ اللَّهِ تَعَالَى، وَذَلِكَ كَالْأَصْلِ الْكُلِّيِّ وَالْقَاعِدَةِ الْجَمِيلَةِ، شَرَعَ بَعْدَ ذَلِكَ فِي ذِكْرِ التَّكَالِيفِ الْمَفْصَّلَةِ، فَبَدَأَ بِذِكْرِ مَا يَحِلُّ وَمَا يَحْرَمُ مِنَ الْمَطْعُومَاتِ، فَقَالَ: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ**

بِهَيْمَةِ الْأَنْعَامِ ﴿المائدة: ۷۵﴾ ”جان لیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت کے پہلے ٹکڑے کے ساتھ تمام مکلفین پر ایک کلی اصول اور بہترین قاعدے کے ذریعے اپنے تمام احکام تکلیفیہ کی پیروی لازم کی تو اب ان احکام تکلیفیہ کی تفصیل بیان کرنا شروع کی ہے۔ ابتدا کھانے کی چیزوں میں سے حلال و حرام کے ذکر سے کی ہے، لہذا فرمایا: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهَيْمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدة: ۷۵) (تمہارے لیے چوپائے حلال کر دیئے گئے ہیں)۔“ (التفسیر الکبیر للرازی: ۹۹/۱)

علامہ آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) بھی لکھتے ہیں: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهَيْمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدة: ۷۵) شروع فی تفصیل الأحکام الّتی أمر بوفائها ، وبدأ سبحانه بذلك ، لأنّه يتعلّق بضروریات المعاش ... ”﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهَيْمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدة: ۷۵) (تمہارے لیے چوپائے حلال کر دیئے گئے ہیں) یہ ان احکام کی تفصیل کی ابتدا ہے، جن کے ایفاء کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ابتدا اس لیے کی ہے کہ یہ معاشی ضروریات کے متعلق ہے۔“ (روح المعانی للآلوسی: ۴۹/۶)

معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے امت مسلمہ کی متفقہ تفسیر کو سینے سے لگایا ہے، ان کو ”جملہ معترضہ“ کہہ کر جان چھڑانے کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ ان کے نزدیک یہ الفاظ آیت کے پہلے ٹکڑے سے بالکل ہم ربط ہیں۔ اب کوئی میرٹھی صاحب کے معتقدین سے پوچھے کہ کیا اس آیت میں ان کو ایک ہی آیت کے دو ٹکڑوں کی بے ربطی نظر نہیں آئی؟ کیا وہ اب بھی امت مسلمہ کی اتفاقی تفسیر کے خلاف میرٹھی صاحب کی اس یا وہ گوئی اور بے ہودہ بکواس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

② ہم گزشتہ صفحات میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا وقت عمرہ القضاء سے پہلے ہونے کا دعویٰ کرنا زری خود سری اور علم تفسیر سے جہالت کا نتیجہ ہے۔ کسی ایک مسلمان مفسر نے چودہ سو سال کے عرصہ میں آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا، نہ ہی میرٹھی صاحب اور ان کے معتقدین کے پاس اس بات پر کوئی دلیل ہے، لہذا آیات کے ہم نسق ہونے کو بنیاد بنا کر صحیح بخاری پر یہ اعتراض اور راویان حدیث، خصوصاً صحابی رسول سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ یا وہ گوئی بالکل فضول ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو نہ سمجھا تھا۔ یہ تو خود منکرین حدیث کی اپنی بے عقلی اور علم قرآن سے دُوری ہے کہ آیات قرآنیہ کا صحیح وقت نزول اور صحیح تفسیر ان کی سمجھ میں نہیں آسکی۔



قارئین کرام! سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی رسول ہیں، جو کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بدر، احد اور خندق سمیت تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری کے اندران کی شان میں ایک حدیث موجود ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

شهدت من المقداد مشهدا ، لأن أكون صاحبه أحب إلي مما عدل به ، أتى النبي صلى الله عليه وسلم ، وهو يدعوا على المشركين ، فقال : لا نقول كما قال قوم موسى : ﴿ اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا ﴾ (المائدة : ٢٤/٥) ، ولكننا نقاتل عن يمينك وعن شمالك وبين أيديك وخلفك ، فرأيت النبي صلى الله عليه وسلم أشرق وجهه وسرّ ، يعني : قوله . ”میں نے مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا وہ (رشد انگیز) مقام دیکھا ہے کہ میرا اس مقام والا ہونا مجھے اس کے برابر والے ہر عمل سے محبوب ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ (غزوہ بدر والے دن) نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ مشرکین کے خلاف بددعا کر رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا، ہم اس طرح نہیں کہیں گے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ﴿ اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا ﴾ (المائدة : ٢٤/٥) (آپ اور آپ کا رب جاؤ اور لڑائی کرو)، بلکہ ہم تو آپ کے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے لڑیں گے۔ (سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ) میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ کا چہرہ مبارک چمک اٹھا اور اس بات نے آپ ﷺ کو خوش کر دیا۔“

(صحیح بخاری: ٣٩٥٢)

لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صریح گستاخی کرنے والے ناعاقبت اندیشوں کو صحابہ کرام کی یہ منقبت کیسے ہضم ہو؟ انہوں نے اس پر اعتراض کی ٹھان لی ہے۔

آئیے امت کے اس اتفاقی فیصلے پر میرٹھی صاحب کی طرف سے کیے گئے فضول اعتراض کا جائزہ لیتے ہوئے فیصلہ کریں کہ حق پر کون ہے، پوری امت مسلمہ یا میرٹھی صاحب؟

**اعتراض :** ”یہ حدیث روایت کر کے طارق بن شہاب نے حضرت مقداد بن

اسودؓ کی منقبت بیان کی تھی، لیکن حضرت مقداد کی جلالتِ قدر اس جھوٹی منقبت کی محتاج نہ تھی۔ میں اسے جھوٹی منقبت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ --- اللہ تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں ذکر فرمایا ہے۔ اسی سے حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کو اور بعد کے مسلمانوں کو یہ واقعہ معلوم ہوا ہے اور بلاشبہ سورۃ المائدہ جنگ بدر کے تقریباً ۵ برس بعد نازل ہوئی ہے۔ پھر ۲ ہجری میں مقداد ابن اسود کو قرآن کا بیان فرمودہ قصہ قرآن کے الفاظ میں کیسے معلوم ہو سکتا تھا اور وہ اپنی اور مسلمانوں کی وفاداری و جاں نثاری کا ذکر کرتے ہوئے اس قصہ کا حوالہ کیسے دے سکتے تھے اور یقیناً یہ غلط بات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نہیں کہی۔ یہ طارق بن شہاب کی ہی دروغ بانی ہے اور سخت حیرت و افسوس ہے کہ امام بخاری تک بھی کسی راوی نے اس پر غور نہیں کیا اور امام بخاری نے بھی اس جھوٹی

روایت کو درج صحیح کر دیا۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۶۲۸-۶۳)

**جواب:** قارئین کرام! میرٹھی صاحب نے حدیث کا ترجمہ کرتے وقت خیانتِ علمی سے کام لیتے ہوئے اپنی طرف سے ”بدر کے دن“ کے الفاظ بڑھادیئے ہیں، حالانکہ:

① صحیح بخاری کی اس حدیث میں اس طرح کا کوئی لفظ قطعاً موجود نہیں، نہ ہی اس واقعہ کے وقوع کو غزوہ بدر سے پہلے قرار دینا صحیح ہے، بلکہ یہ تو غزوہ بدر کے بہت بعد سورۃ مائدہ کے نزول کے بعد کا واقعہ ہے، لہذا اسے خواہ غزوہ بدر کے دوران کا واقعہ گردان کر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا بہت بڑی تلبیس اور بہت بڑا دھوکا ہے۔

مسند احمد (۳۱۴/۴) اور السنن الکبریٰ للنسائی (۱۱۴۰)، تاریخ دمشق (۶۰/۶۰) والی روایت میں اس واقعہ کا ذکر غزوہ بدر کے دوران کیا گیا ہے، لیکن یہ روایت تمام سندوں میں امام سفیان کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، کہیں بھی سماع کی تصریح نہیں مل سکی۔

طبقات ابن سعد (۱۴/۲) والی روایت کی کئی سندیں ہیں، جن میں ایک سند میں امام ابن سعد کا استاذ محمد بن عمر الواقدی ہے، جو کہ مشہور و معروف ”کذاب“ اور ”متروک“ ہے۔ بات اگر یہیں تک ہوتی تو شاید دوسری سندوں کی تحقیق کی جاتی، لیکن اس سے بھی سنگین صورت حال یہ ہے کہ امام ابن سعدؓ نے یہ صراحت کر دی ہے کہ ان سب راویوں کی حدیثیں آپس میں مل گئی ہیں۔ (۵/۲)

اب اگر دوسری سندیں صحیح ثابت بھی ہو جائیں تو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہماری مطلوبہ بات واقدی

”کذاب“ والی سند سے ہے یا دوسری اسانید سے، لہذا اس سے اس واقعہ کے غزوہ بدر میں ہونے پر استدلال کرنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں بھی جنگ بدر کے بیان کے ساتھ سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروی نہیں کہ انہوں نے کہا ہو: ﴿إِذْ هَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَفَاتِلًا﴾ (المائدة: ۲۴/۵) (آپ اور آپ کا رب جاؤ اور لڑائی کرو)، بلکہ وہاں پر غزوہ بدر کے تذکرہ میں یہ الفاظ مروی ہیں: وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ! لَوْ سَرْتُ بِنَا إِلَى بَرَكِ الْغَمَادِ لَسَرْنَا مَعَكَ حَتَّى نَنْتَهِيَ إِلَيْهِ... ”اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے! اگر آپ ہمیں برک الغما دمقام تک لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ چلتے رہیں گے حتیٰ کہ وہاں پہنچ جائیں۔“ (الطبقات الكبرى لابن سعد: ۱۴/۲)

اس بارے میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی مسند احمد (۱۰۵/۳، ۱۸۸)، سنن نسائی (۴۳۴۸)، ابن حبان (۱۱۱۴۱، ۸۵۸۰)، ابن جریر (۴۷۲۱) وغیرہم والی اسی معنی والی حدیث کی سند حمید الطویل کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

اسی طرح تفسیر ابن ابی حاتم (۱۶۵۹/۶) کی اس معنی والی حدیث ابی ایوب کی سند عبد اللہ بن لہیعہ کے ”ضعف“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

الحاصل جو سندیں اس واقعہ کے غزوہ بدر کے موقع پر ہونے کے بارے میں صحیح ثابت ہیں، مثلاً صحیح بخاری (۳۹۵۲)، مسند احمد (۲۱۹/۳، ۲۲۰، ۲۵۸)، ابن حبان (۴۷۲۲)، تاریخ دمشق (۱۵۹/۶۰) وغیرہم میں سے کسی میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں، جن کی بنا پر میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح حدیث پر ایک بالکل غیر صحیح اعتراض کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ غزوہ بدر میں بھی سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے اپنے جذبے کا اظہار کیا تھا، لیکن ان الفاظ سے نہیں، کیونکہ اس وقت اس آیت کا نزول ہی نہ ہوا تھا، البتہ دوبارہ کسی موقع پر جب جذبہ جہاد کا اظہار سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کیا، اس میں یہ الفاظ موجود ہیں، کیونکہ اس وقت ان کا نزول ہو چکا تھا۔ وَلِلَّهِ الْحَمْدُ!

② ہو سکتا ہو کہ میرٹھی صاحب کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس حدیث کو باب غزوة البدر کے متصل بعد ذکر کرنے سے شبہ ہو گیا ہو کہ شاید امام بخاری نے اس حدیث کو غزوہ بدر کے متعلق سمجھا



ہے، لیکن یہ بات درست نہیں، کیونکہ امام موصوف نے اس حدیث کو ایک مستقل باب کے تحت ذکر کیا ہے، نہ کہ باب غزوة البدر کے تحت۔

یوں میرٹھی صاحب کا اسے غزوہ بدر کا واقعہ قرار دے کر صحیح بخاری پر اعتراض کرنا خود ان کی کم علمی و کم فہمی ہے۔ کاش پوری امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے کو چیلنج کرنے کے لیے میرٹھی صاحب تھوڑی سی ہی تحقیق سے کام لے لیتے!

③ ہم پچھلی حدیث کے دفاع میں بالنتفیل یہ ذکر کر چکے ہیں کہ سیدنا طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ صحابی رسول ہیں، لہذا اس صحابی رسول کو بار بار ”دروغ باف“ کہہ کر ان کی گستاخی کی ہے اور اس ارتکاب سے میرٹھی صاحب نے اپنی عقلی گنوانے کے سوا کچھ فائدہ حاصل نہیں کیا۔

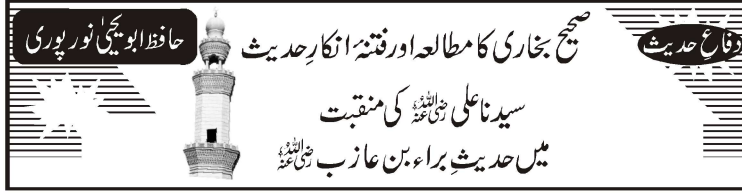
④ میرٹھی صاحب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے راویان حدیث پر افسوس کر رہے ہیں تو درحقیقت ”چور بھی کہے چور چور“ کے مصداق بنے ہیں۔ اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو ان کی عقل پر انتہائی افسوس کرنا چاہیے کہ انہوں نے اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحابہ کرام اور ثقہ و معتبر محدثین کرام پر ناحق زبان درازی کر کے اپنے ہی ایمان کا نقصان کر لیا ہے۔

⑤ اب تو قارئین کرام، خصوصاً شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کے معتقدین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس حدیث کو ”جھوٹی روایت“ کہنا خود میرٹھی صاحب کا بدترین جھوٹ ہے۔ ہمارے اس منصفانہ تجزیہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ امت مسلمہ کے اتفاق کو ٹھکانے والا شخص لاکھ دعوؤں کے باوجود جاہل اور کم فہم ہی ہوتا ہے، کیونکہ عقل مندی اجماع امت کو تسلیم کر لینے میں ہی تو ہے۔



## اعتذار

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت پر نماز جنازہ پڑھائی، اس پر چار تکبیریں کہیں اور پھر ایک ہی سلام پھیرا۔“ (سنن الدارقطنی ۱۷۷۲، ح ۱۷۹۹) **السنة**، شمارہ نمبر ⑤، صفحہ نمبر ۲۳ پر یہ حدیث درج ہے، لیکن اس کی سند حفص بن غیاث کی تدلیس کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔ ② **السنة**، شمارہ نمبر ⑤، صفحہ نمبر ۵ پر حافظ نووی کا قول عبد اللہ بن عبد اللہ کے متعلق لکھا گیا ہے، جبکہ وہ اسماعیل بن ابی اویس کے بارے میں ہے۔



قارئین کرام! آپ گزشتہ اوراق، خصوصاً سابقہ حدیث کے مطالعہ سے بخوبی یہ جان چکے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی میرٹھی صاحب کی مرغوب عادت ہے، جسے وہ بہانے بہانے سے پورا کرتے رہتے ہیں۔ بات یہیں نہیں رکتی، بلکہ اگر کوئی روایت کسی صحابی کی شان بیان کر رہی ہو تو ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے ہیں اور وہ اس میں کوئی اعتراض کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔

صحیح بخاری کی زیر بحث حدیث میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں:

- ① صلح حدیبیہ کا قصہ
  - ② رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے واپسی کے وقت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا چچا چچا پارتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے لگنا اور پھر اس کی کفالت میں اختلاف کا پورا واقعہ۔
  - ③ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا آپ ﷺ سے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کے بارے میں رائے معلوم کرنا اور آپ ﷺ کا رضاعی بہن کہہ کر اس نکاح سے انکار کر دینا۔
- بات یہیں تک ہوتی تو شاید منکرین حدیث کو بھاجاتی، لیکن ہوا یوں کہ اس حدیث میں تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت و منقبت بیان ہوئی ہے۔

- سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **أنت منی وأنا منك .**
- ”آپ مجھ سے اور میں آپ سے ہوں۔“
- سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے یوں اظہارِ تعلق فرمایا: **أشبهت خلقی وخلقی .**
- ”آپ سیرت و صورت میں مجھ سے مشابہ ہیں۔“
- اور سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: **أنت أخونا ومولانا .**
- ”آپ ہمارے بھائی اور مولیٰ ہیں۔“

میرٹھی صاحب کے عنوان سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس حدیث پر اعتراض کی وجہ یہی ہے کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت و منقبت کا بیان ہے اور وہ اس سے ان کو بہت چڑ ہے۔

آئیے ان کے اس متفق علیہ صحیح حدیث پر کیے گئے اعتراضات کی علمی حیثیت معلوم کریں!

**اعتراض نمبر ① :** ”اس حدیث پر کلام کرنے سے پہلے میں عبید اللہ بن موسیٰ عیسیٰ کا تعارف کر دینا چاہتا ہوں، جس سے امام بخاری نے یہ حدیث سنی تھی۔ عبید اللہ بن موسیٰ عیسیٰ کثیر الحدیث شخص تھا۔ کثرتِ احادیث کی بنا پر اس کا شمار حافظانِ حدیث میں ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے اور چند روز اس سے ملاقات کے لیے آنے والوں پر اس کے علم اور زہد و عبادت اور تقشف کا بڑا گہرا اثر پڑتا تھا اور وہ اس کے عقیدت مند بن جاتے تھے، لیکن شیعہ فکر و نظر کا حامل اور اس میں غلو و کج روی میں مبتلا تھا۔ یعقوب بن سفیان نے اس کے متعلق کہا ہے: شیعہ، وإن قال قائل: رافض، لم أنکر علیہ، وهو منکر الحدیث۔ (وہ شیعہ ہے اور اگر کوئی اسے رافضی بتائے تو میں اس کی تردید نہ کروں گا اور وہ غلط بیان شخص ہے)۔ ابواسحاق جوزجانی کا قول ہے، عبید اللہ بن موسیٰ اُغلیٰ و أسوأ مذہبا و أدوی للعجائب۔ (عبید اللہ مسلک کے لحاظ سے بہت برا اور غلو کا راور عجیب، یعنی غیر معقول روایات کو کثرت سے بیان کرنے والا ہے)، حافظ ابو مسلم بغدادی نے کہا ہے عبید اللہ بن موسیٰ من المتروکین، ترکہ أحمد لتشیعہ۔ (عبید اللہ ان راویوں میں سے ہے، جن کی بیان کردہ حدیثوں کو اہل حق نے بیان کرنا چھوڑ دیا ہے، امام احمد نے اس کے غالی شیعہ، یعنی رافضی ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا ہے، یعنی اس کی روایات کو ناقابل قبول قرار دے دیا تھا)۔ ساجی کی تحقیق یہ ہے، عبید اللہ صدوق، کان یفرط فی التشیع۔

امام بخاری اور اوائل طلب میں اس کے پاس گئے اور اس سے حدیثیں سنی اور یاد کی تھیں۔ اس کے زہد و تعبد اور کثرتِ روایات سے بخاری بھی فریب کھا گئے۔ یہ حدیث عبید اللہ بن موسیٰ نے بخاری کو ایسی تلبیس اور عیاری کے ساتھ سنائی تھی کہ بخاری اسے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث صحیح گمان کر بیٹھے اور اپنی کتاب میں اسے ثبت کرنے کی غلطی کر گزرے۔“

(«صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۶۶/۱)

**جواب :** قارئین! شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب کا عبید اللہ بن موسیٰ عیسیٰ پر یہ جرح نقل کرنا ان کی اصولِ حدیث اور علمِ رجال سے جہالت کی روشن دلیل ہے، کیونکہ:

(۱) عبید اللہ بن موسیٰ کو بہت سے محدثین نے ثقہ و معتبر قرار دیا ہے، جن کا ذکر میرٹھی

صاحب خیانت کرتے ہوئے ڈکار گئے ہیں۔ آئیے ملاحظہ فرمائیں:

① امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ (۱۵۸-۲۳۳ھ) فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ راوی تھے۔

(الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۳۳۴/۵، وسندہ صحیح)

② امام ابو حاتم رحمہ اللہ (۱۹۵-۲۷۷ھ) ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

صدوق، کوفی، حسن الحديث، وأبو نعيم أتقن منه، وعبيد الله أثبتهم في إسرائيل، وهو ثقة.. ”یہ سچے آدمی تھے، کوفہ کے رہائشی تھے، ان کی حدیث (کم از کم) حسن ہوتی ہے۔ ابونعیم ان سے پختہ تھے، لیکن اسرائیل سے بیان کرنے میں تو عبید اللہ سب سے بڑھ کر معتبر ہوتا ہے، وہ ثقہ راوی ہے۔“ (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم: ۳۳۴/۵، وسندہ صحیح)

③ امام احمد بن عبد اللہ الحنبلی رحمہ اللہ (۱۸۱-۲۴۱ھ) فرماتے ہیں: کوفی، ثقة،

عالم بالقرآن، صدوق. ”وہ کوفہ کے رہنے والے، ثقہ تھے، قرآن کریم کے عالم اور سچے تھے۔“ (الثقات للعجلی: ۱۴۴/۲)

④ امام ابن سعد رحمہ اللہ (۱۶۸-۲۴۰ھ) لکھتے ہیں: وکان ثقة، صدوقاً،

إن شاء الله... ”وہ ثقہ اور سچے تھے، ان شاء اللہ!“ (الطبقات الكبرى لابن سعد: ۴۰۰/۶)

⑤ امام عمر بن احمد، ابن شاہین رحمہ اللہ (۲۹۷-۳۸۵ھ) فرماتے ہیں:

صدوق، ثقة، وکان يضطرب فی حديثه عن سفیان اضطرابا قبيحا.

”وہ صدوق اور ثقہ تھے، البتہ سفیان (ثوری) کی احادیث میں سخت اضطراب میں پڑتے

تھے۔“ (تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین: ۱۶۵/۱)

⑥ امام ابن حبان رحمہ اللہ (۳۵۴م) بھی ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ (الثقات: ۱۵۲/۷)

⑦، ⑧ امام بخاری رحمہ اللہ (۱۹۴-۲۵۶ھ) اور امام مسلم رحمہ اللہ (۲۰۴-۲۶۱ھ) کا ان سے

روایات بیان کرنا ان دونوں کے نزدیک عبید اللہ بن موسیٰ کے ثقہ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ انہوں نے صحت کی شرط کو ملحوظ رکھا ہے۔

⑨ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (۲۲۳-۳۱۱ھ) نے بھی اپنی کتاب میں صحت کی شرط لگائی ہے اور

عبید اللہ بن موسیٰ سے کثرت کے ساتھ روایات بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ان کے نزدیک بھی ثقہ ہیں۔

⑩ امام ابن الجارود رحمہ اللہ (م ۳۰۷ھ) نے اپنی بھی کتاب المنقذی میں ان سے کئی ایک مقامات پر روایت لے کر ان کی توثیق کی ہے، کیونکہ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں صحت کی شرط رکھی ہے۔

تلك عشرة كاملة !

اس کے علاوہ امت مسلمہ کے تمام محدثین و ناقدین کا صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر اتفاق کرنا عبید اللہ بن موسیٰ العباسی کی ثقاہت پر زبردست دلیل ہے۔

پھر توثیق و جرح کے ان سب اقوال کو مدنظر رکھ کر ناقد رجال علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے عبید اللہ بن موسیٰ کو ثقہ اور بڑے بڑے علمائے حدیث میں سے ایک کہا ہے۔ (الکاشف للذہبی: ۳۵۹۳)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں سب اقوال کا خلاصہ یہ نکالتے ہیں:

ثقة ، كان يتشيع . ”ثقة تھے، شیعیت میں مبتلا تھے۔“ (تقریب التہذیب: ۴۳۴۵)

اب قارئین کرام ہی بتائیں کہ اتنے محدثین کی طرف سے عبید اللہ بن موسیٰ کے ثقہ ہونے کی صراحت کے بعد میرٹھی صاحب کی بات کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے؟ کیا کسی راوی کے بارے میں ناقدین رجال کی آراء کو علامہ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور باقی ساری امت مسلمہ بہتر سمجھتی ہے یا فن رجال سے یکسر جاہل منکرین حدیث؟ فیصلہ خود کریں!

(۲) محدثین کا عبید اللہ بن موسیٰ کو شیعہ کہنا کوئی جرح نہیں، کیونکہ متقدمین کی اصطلاح میں ”تشیع“ کا مطلب صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اعتقاد ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

التَّشِيعُ فِي عَرَفِ الْمُتَقَدِّمِينَ هُوَ اعْتِقَادُ تَفْضِيلِ عَلِيٍّ عَلَى عِثْمَانَ ، وَأَنَّ عَلِيًّا كَانَ مَصِيْبًا فِي حُرُوبِهِ ، وَأَنَّ مُخَالَفَهُ مَخْطِئٌ ، مَعَ تَقْدِيمِ الشَّيْخِينَ وَتَفْضِيلِهِمَا ، وَرَبَّمَا اعْتَقَدَ بَعْضُهُمْ أَنَّ عَلِيًّا أَفْضَلَ الْخَلْقِ بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَإِذَا كَانَ مُعْتَقِدُ ذَلِكَ وَرَعَا ، دِيْنًا ، صَادِقًا ، مُجْتَهِدًا ، فَلَا تَرْدَ رَوَايَتُهُ بِهَذَا ، لَا سِيَّمَا إِنْ كَانَ غَيْرَ دَاعِيَةٍ . ”متقدمین کی اصطلاح میں تشیع سے مراد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا

عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا قائل ہونے کے ساتھ ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دینا ہے، نیز یہ کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں حق پر تھے اور آپ کے مخالفین غلطی پر تھے۔ ان (متقدمین کی اصطلاح میں شیعہ لوگوں) میں سے کوئی (تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کا احترام کرنے کے ساتھ

ساتھ) بسا اوقات یہ بھی عقیدہ بھی رکھ لیتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول کریم ﷺ کے بعد سب مخلوق سے افضل ہیں۔ جب اس اعتقاد والا آدمی پر ہیز گار، دین دار، سچا اور مجتہد ہو تو اس کی روایت کو رد نہیں کیا جائے گا۔“ (تہذیب التہذیب لابن حجر: ۸۷۸)

معلوم ہوا کہ متقدمین دشمن صحابہ کو شیعہ نہیں کہتے تھے، بلکہ رافضی کہتے تھے، لہذا جب راوی سچا ہو تو شیعہ ہونا اس کی روایت میں کوئی جرح نہیں۔ اب ہر منصف مزاج آدمی خود ہی اندازہ لگا لے کہ بھلا میرٹھی صاحب جیسے شخص کا عبید اللہ بن موسیٰ پر یہ اعتراض کرنا اور اس وجہ سے صحیح بخاری کی صحت کو مشکوک سمجھنا کہاں کا انصاف ہے؟

(۳) رہا میرٹھی صاحب کا ابواسحاق جوزجانی کی عبید اللہ بن موسیٰ پر جرح نقل کرنا تو یہ بھی ان کے اقوال محدثین اور علم رجال کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اولاً تو قریباً ایک درجن کے قریب محدثین کی توثیق کے مقابلے میں ابواسحاق جوزجانی کی جرح کچھ حیثیت نہیں رکھتی، ثانیاً یہ جرح اصولاً بھی مردود ہے۔

اگر میرٹھی صاحب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی درج ذیل عبارت ہی پڑھ لیتے تو ان کی تسلی ہو جاتی اور وہ اتنی بڑی جہالت کا منہ نہ دیکھتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جن لوگوں کے جرح والے قول کو قبول کرنے میں توقف کرنا ضروری ہے، ان میں سے وہ شخص بھی ہے، جس کی مجروح راوی سے بسبب اختلاف عقیدہ عداوت ہو، چنانچہ جب کوئی ماہر (رجال) آدمی ابواسحاق جوزجانی کی اہل کوفہ کے خلاف جرح پر غور کرے گا، وہ عجیب طرز دیکھے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقیدہ نصب (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عداوت) میں سخت انحراف کا شکار ہیں، جبکہ کوفہ والے تشیع (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت) میں مشہور ہیں، لہذا آپ دیکھیں گے کہ اہل کوفہ میں سے جس کو بھی ابواسحاق جوزجانی نے ذکر کیا ہے، اس پر تیز زبان اور سخت عبارت کے ساتھ جرح کرنے میں توقف نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ امام اعمش، ابو نعیم اور عبید اللہ بن موسیٰ (عبسی)، جیسے حدیث کے پایوں اور روایت کے ستونوں پر بھی جرح کرنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب جوزجانی کے مقابلے میں جب ان کا ہم پلہ امام یا ان سے بڑا امام اس آدمی کو ثقہ کہہ دے، جس کو جوزجانی کے ضعیف کہا ہو تو توثیق کو قبول کیا جائے گا۔۔۔“

(لسان المیزان لابن حجر: ۱۶۸)

❁ اسی طرح امام یعقوب بن سفیان الفسوی کا عبید اللہ بن موسیٰ کو رافضی کہنا (المعرفة والتاریخ: ۲۰۹/۳) ان کی غلط فہمی ہے اور جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے، نیز اس وجہ سے بھی قابل التفات نہیں کہ رافضی لوگ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، خصوصاً شیخین، یعنی سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کو بہت برا بھلا کہتے ہیں، جبکہ عبید اللہ بن موسیٰ سے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک بہت ہی زبردست قول مروی ہے۔

امام ابوبکر الشافعی، جن کے بارے میں مشہور ناقد رجال امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جبل ، ثقة ، مأمون ، ما كان في ذلك الزمان أوثق منه .

”یہ (حافظے اور ضبط) کے پہاڑ تھے، ثقہ و مامون تھے، اس دور میں ان سے بڑھ کر ثقہ کوئی نہ تھا۔“ (سوالات حمزة بن يوسف السهمي: ۴۰۳)

یہ جبل الحفظ والعلم امام ابوبکر الشافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی غیلانیات میں اس قول کو یوں باسند بیان کرتے ہیں:

حدثنا محمد بن سليمان بن الحارث الواسطي ، ثنا عبید اللہ بن موسیٰ العباسی ، ثنا مالک بن مغول عن عون بن أبي جحيفة عن أبيه ، قال : قال عليّ : خيرنا بعد نبينا أبو بكر وعمر .

”ہمیں محمد بن سلیمان بن حارث واسطی (ثقة ، انظر: سير اعلام النبلاء: ۳۸۷/۱۳) نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں، ہمیں عبید اللہ بن موسیٰ عباسی نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں، ہمیں مالک بن مغول (ثقة ، ثبت ، حجة) نے حدیث بیان کی، وہ عون بن ابی جحیفہ (ثقة) سے حدیث بیان کرتے ہیں، وہ اپنے والد (صحابی رسول سیدنا ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم میں سے سب سے بہتر سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔“

(كتاب الفوائد (الغيلانيات) لابی بكر الشافعی: ۱۱۴/۸، رقم: ۷۱، وسنده صحيح كما ترى)

❁ اب بھی کوئی منکر حدیث اگر عبید اللہ بن موسیٰ کو رافضی کہہ کر صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کی جسارت کرے تو اس نا عاقبت اندیش کی اپنی ہی بد بختی ہے!

اب تو قارئین کرام کو یقین ہو جانا چاہیے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بقول میرٹھی صاحب فن رجال میں ماہر نہیں ہیں، ورنہ انہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے تھی کہ عبید اللہ بن موسیٰ کوئی ہیں اور سیدنا

علیؑ کی زیادہ محبت کی وجہ سے جو زجانی نے ان پر جرح کی ہے، کیونکہ یہ ناصبی (سیدنا علیؑ سے نفرت کرنے والے) تھے۔ اور یعقوب بن سفیان کی جرح ان کی غلط فہمی ہے۔

(۴) پھر اگر اصولاً اس جرح کے مقابلے میں کوئی ایک بھی امام عبید اللہ بن موسیٰ کو ثقہ کہہ دیتا تو اس کی بات قبول کی جانی ضروری تھی، ہم نے تو قریباً ایک درجن محدثین و نقادِ رجال کے اقوال سے موسیٰ بن عبید اللہ کی توثیق ثابت کر دی ہے۔ کیا اب بھی کوئی شخص میرٹھی صاحب کو صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح احادیث پر اعتراضات کرنے کے قابل سمجھتا ہے؟

(۵) مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہماری بیان کی ہوئی صراحتِ محدثین کے مطابق عبید اللہ ابن موسیٰ اپنے شیخ اسرائیل بن یونس سے بیان کرنے میں سب سے پختہ کار و معتبر ہے اور صحیح بخاری کی اس حدیث میں بھی عبید اللہ اپنے اسی شیخ اسرائیل بن یونس سے ہی بیان کر رہا ہے، لیکن میرٹھی صاحب نے اپنی علمی بے مائیگی کی بنا پر اس حدیث پر اعتراض کر کے اپنی جہالت پر مہر ثبت کر دی ہے۔

(۶) رہا امام ساجی کا ان کے بارے میں یہ کہنا کہ: کان یفرط فی التشیع .

”یہ تشیع میں بڑھے ہوئے تھے۔“ (تہذیب التہذیب: ۴۷/۷)

❀ اولاً تو اس کی کوئی سند ہمیں نہیں مل سکی، جس سے معلوم ہو کہ حافظ ابن حجرؒ کو امام ساجی کا یہ قول کس ذریعے سے پہنچا تھا؟

❀ ثانیاً ان الفاظ سے پہلے امام ساجی کا عبید اللہ بن موسیٰ کو ”صدوق“ کہنا خود میرٹھی صاحب نقل کر چکے ہیں، لہذا اگر امام ساجی سے یہ قول ثابت ہو بھی جائے تو ان کے نزدیک تشیع میں بڑھنے سے مراد رافضی ہونا اور حدیث میں غیر معتبر ہو جانا قطعاً نہیں ہو سکتا۔

متقدمین محدثین کے نزدیک بھی شیعیت میں غلو سے مراد رافضیت نہیں ہوتی، لہذا میرٹھی صاحب کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ غالی شیعہ رافضی ہوتا ہے، بلکہ جب متقدمین کسی راوی کے بارے میں غالی شیعہ کے الفاظ استعمال کریں تو اس سے مراد سیدنا علیؑ کی شان میں غلو کرتے ہوئے ان کا مقام و مرتبہ سیدنا ابوبکر و عمرؓ سے بڑھانا اور سیدنا علیؑ کے مخالفین کو غلطی پر قرار دینا ہوتا ہے، جیسا کہ حافظ ذہبیؒ نے اس کی صراحت کی ہوئی ہے۔ (میزان الاعتدال للذہبی: ۶۰/۸)

کاش کہ میرٹھی صاحب اصولِ حدیث کا کچھ علم حاصل کر لیتے!



(۷) امام احمد رحمہ اللہ کا اس کے غالی شیعہ، ”یعنی رافضی“ ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دینا بھی باسند ثابت نہیں ہو سکا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس بات کا اظہار کہاں کیا ہے؟ منکرین حدیث اس کی سند تلاش کر کے بتائیں، پھر ہم اس کا جواب اصول حدیث کے مطابق یہ دے دیں گے کہ تشیع کوئی جرح نہیں ہے۔ نیز ہم یہ بھی کہیں گے کہ اس غیر ثابت جرح کے خلاف امام احمد رحمہ اللہ سے یہ قول بالکل صحیح ثابت ہے کہ : رَبَّمَا أَخْرَجْت عَنْهُ ، وَرَبَّمَا ضَرَبْتَ عَلَيْهِ ، حَدَّثَ عَنْ قَوْمٍ غَيْرِ ثِقَاتٍ ، فَإِنْ كَانَ مِنْ حَدِيثِ الْأَعْمَشِ فَعَلَى ذَلِك . ”میں نے کبھی ان کی حدیث بیان کی ہے اور کبھی چھوڑ دی ہے۔ انہوں نے غیر معتبر لوگوں سے احادیث بیان کی ہے۔ اگر اعمش سے اس کی حدیث ہو تو وہ اسی طرح (منکر) ہوگی۔“ (سوالات المروزی : ۳۰۹)

معلوم ہوا کہ امام احمد رحمہ اللہ بھی عبید اللہ بن موسیٰ کو ”ضعیف“ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے شیوخ کی وجہ سے ان کی روایات چھوڑتے تھے، اسی لیے ان کی وہ روایات لے لیتے تھے، جو انہوں نے ثقہ راویوں سے بیان کی ہوتی تھیں۔

رہا میرٹھی صاحب کا اپنا خبثِ باطن کا اظہار کرتے ہوئے یہ الفاظ ”یعنی رافضی“ بڑھانا تو اس کا ردِّ ہماری بیان کردہ اس روایت سے بخوبی ہو جائے گا، جس میں عبید اللہ بن موسیٰ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول روایت کر رہے ہیں۔

نیز ہم گذشتہ سطروں میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اصول حدیث کے مطابق بھی متقدمین کی طرف سے غالی شیعہ کا معنی رافضی نہیں ہو سکتا۔ یہ سراسر جہالت پر مبنی بات ہے۔

یہ ہے میرٹھی صاحب کی اپنی علمی و مطالعاتی قابلیت اور وہ اعتراض کرتے ہیں امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی اس کتاب پر جسے پوری امت نے اتفاق کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

ع ایہہ گستاخ اکھیاں کتھے جاڑیاں !

صحیح بخاری پر اعتراض کرنے کی پاداش میں اتنی سبکی اور شرمندگی اٹھانے کے بعد منکرین حدیث کو چاہیے کہ اب ہی تائب ہو جائیں اور آئندہ ایسی جسارت سے قیامت تک کے لیے سچی اور پکی توبہ کر لیں۔ اگر وہ اس سے باز نہ آئیں گے تو محدثین کے حقیقی وارث اہل الحدیث ان کی تلمیذوں، عیار یوں، غلطیوں اور جہالتوں کو آشکار کرتے رہیں گے۔

إِنْ شَاءَ اللَّهُ !

صحابی رسول سیدنا سالم بن عبید الاشجعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ کے مرض میں آپ ﷺ پر غشی طاری ہوئی، پھر افاقہ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا نماز کا وقت ہو گیا ہے؟ عرض کی گئی، جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا، بلال کو حکم دو کہ وہ اذان کہیں اور ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی، میرے والد تو نہایت نرم دل آدمی ہیں۔ جب وہ اس جگہ (مصلیٰ رسول) پر کھڑے ہوں گے تو رونے لگیں گے اور نماز نہ پڑھاسکیں گے، اگر آپ کسی اور کو حکم دیں تو اچھا ہوگا۔ آپ ﷺ پر پھر غشی طاری ہوئی، پھر افاقہ ہوا تو فرمایا، بلال کو حکم دو کہ وہ اذان کہیں اور ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، تم تو یوسف والیاں ہو۔ پھر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا، انہوں نے اذان کہی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا، انہوں نے نماز پڑھائی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے کچھ سکون محسوس کیا تو فرمایا، میرے سہارا لینے (اور مسجد جانے) کے لیے کسی کو دیکھو۔ بریرہ اور ایک آدمی آئے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کا سہارا لیا (اور مسجد میں آ گئے)، جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو (مصلیٰ امامت سے) پیچھے ہٹنے لگے، آپ ﷺ نے ان کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ اپنی جگہ میں رہیں، یہاں تک کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پوری کر لی۔ پھر رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اللہ کی قسم! میں کسی کو یہ کہتے نہیں سنوں گا کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہیں، مگر اپنی اس تلوار سے قتل کر دوں گا اور کہا، لوگ ان پڑھتے تھے، ان میں آپ ﷺ سے پہلے کوئی نبی نہیں تھا (جہالت ابھی باقی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کیسے فوت ہو سکتے ہیں؟)۔ لوگ سہم گئے اور انہوں نے کہا، اے سالم! تم رسول اللہ ﷺ کے ساتھی (سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے پاس جاؤ اور ان کو بلاؤ۔ میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، آپ رضی اللہ عنہ اپنی مسجد میں تھے، میں آپ رضی اللہ عنہ کے پاس روتے ہوئے اور دہشت زدہ گیا۔ جب آپ رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھا تو پوچھنے لگے، کیا رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں؟ میں نے کہا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں کہ میں کسی کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنوں گا، مگر اپنی اس تلوار سے اسے قتل کر دوں گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا، چلو۔ میں آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلا۔ آپ رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو لوگ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لوگو! مجھے راستہ دو! لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو راستہ دے دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ آئے کر رسول اللہ ﷺ پر جھک گئے اور آپ رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا، پھر قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ (الزمر: ۳۰/۳۹) (اے نبی! یقیناً آپ فوت ہونے

والے ہیں اور وہ کافر بھی فوت ہونے والے ہیں)، پھر لوگوں نے کہا، اے اللہ کے رسول کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! لوگوں نے یقین کر لیا کہ آپ ﷺ سچ کہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا، اے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی! کیا رسول اللہ ﷺ کا جنازہ پڑھا جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں! انہوں نے کہا، کیسے؟ فرمایا، کچھ لوگ (حجرہ عانسہ میں) داخل ہوں گے اور اللہ اکبر کہیں گے، درود و سلام پڑھیں گے اور دعا کریں گے، پھر وہ نکل آئیں گے، پھر کچھ لوگ داخل ہوں گے اور اللہ اکبر کہیں گے، درود و سلام پڑھیں گے اور دعا کر کے نکل آئیں گے، یہاں تک کہ (تمام) لوگ داخل ہو جائیں گے۔ لوگوں نے کہا، اے اللہ کے رسول کے ساتھی؟ کیا رسول اللہ ﷺ کو دفن کیا جائے گا؟ فرمایا، ہاں! انہوں نے کہا، کہاں؟ فرمایا، اسی جگہ میں، جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح عمدہ جگہ میں ہی قبض فرمائی ہے۔ انہوں نے جان لیا کہ آپ ﷺ نے سچ فرمایا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ آپ ﷺ کو آپ کے خاندان والے غسل دیں۔ مہاجرین مشورہ کے لیے جمع ہوئے، انہوں نے کہا، آپ ہمارے ساتھ ہمارے انصاری بھائیوں کی طرف چلیں تاکہ ہم ان کو بھی اس معاملے میں اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ انصار نے کہا، ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے ہوگا۔ اس پر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کس کے لیے ان تین فضائل جیسی کوئی فضیلت ہے؟ اس جیسی منقبت کس کے لیے ہے؟ ﴿فَإِنِّي أَتَيْنِي إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبة: ۴۰/۹)، (آپ ﷺ دو میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب آپ ﷺ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے)، وہ دونوں کون ہیں؟ پھر آپ نے ہاتھ بڑھایا اور بیعت کی اور سب لوگوں نے اچھی اور خوبصورت بیعت کی۔“

(الشمال للترمذی: ۳۹۶، مسند عبد بن حمید: ۳۶۵، السنن الکبریٰ (کتاب الوفاة) للنسائی: ۴۲، المعجم الکبیر للطبرانی: ۶۵/۷، دلائل النبوة للبيهقي: ۲۹۹/۷، وسنده صحيح)

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (۱۵۴۱، ۱۶۲۴) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

حافظ بیٹھی لکھتے ہیں: **ورجاله ثقات**۔ ”اس کے راوی ثقہ ہیں۔“ (مجمع الزوائد: ۱۸۳/۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **إسناده صحيح، لكنّه موقوف**۔

”اس روایت کی سند صحیح ہے، لیکن یہ قول صحابی ہے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۵۲۹/۱)

بوصری کہتے ہیں: **هذا إسناده صحيح، رجاله ثقات**۔ ”یہ سند صحیح ہے اور اس کے راوی

ثقہ ہیں۔“ (مصباح الزجاجاة: ۱۶۷/۱، ح: ۱۳۳۴)